میں نے اِسلام کیوں قبول کیا؟

جِلد اوّل

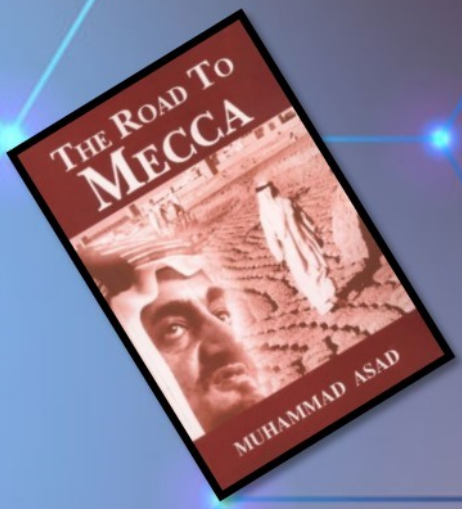

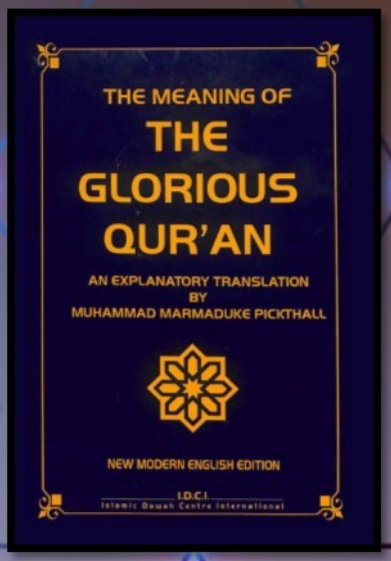

تحریر: زاہد عرفان میاں

میں نے اسلام کیوں قبُول کیا؟

جِلد اوّل

دُنیا میں اسلام قبول کرنیوالے مردوں کے واقعات

یہ حقیر سی کاوش میں اپنی سب سے محبوب ہستی تمام جہانوں کے مالک

اَللّٰہ تبارک و تعالیٰ

کے نام سے منسوب کرتا ہوں، میرے قلم کی طاقت میرے اللہ ہی کی مرہونِ منت ہے

﴿وَٱللَّهُ يَهۡدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ﴾ البقرہ۔213

اور اَللّٰہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے۔

تحریر: زاہد عرفان میاں

کتاب کی اشاعت ممنوع ہے جملہ حقوق بحق راہِ ہدایت پبلیکیشنز محفوظ ہیں

شروع اللہ کا نام لیکر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

ٱدْعُواْ رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ ٱلْمُعْتَدِينَ (الاعراف۔55)

لوگو! اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور مخفی طریقے سے دُعا مانگا کرو۔

نمبر شمار	مضامین فہرست	صفحہ نمبر
	ابتدائی کلمات	6
1	مارماڈیوک ویلیم پکتھال۔ اِسلام قبول کرنیوالا قُرآن کا مُستند انگریزی مُترجم	8
2	لیوپولڈ ویز۔ یہودی نوجوان کی ایمان افروز کہانی	14
3	مارٹن لنگز۔ برطانوی نژاد نو مسلم ابو بکر سراج الدین	39
4	میلکم ایکس۔ سیاہ فام امریکی کا قبولِ اسلام	45
5	کاسیس کلے۔ سیاہ فام کاسیس کلے سے مُحمد علی کلے تک	52
6	اسکپ ایسٹس۔ ایک کیتھولک پادری کا قبولِ اسلام	69
7	فرینینڈ لیوس ایلسن ڈور۔ باسکٹ بال کھلاڑی کریم عبد الجبار کی کہانی	77
8	ڈینس براڈلے فلپس۔ ڈاکٹر ابو امینیہ بلال فلپس کے قبولِ اسلام کا واقعہ	80
9	ڈاکٹر گیری ملر۔ کینیڈین ریاضی دان کا قبولِ اسلام	85
10	مائیکل وُولف۔ میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟	91
11	ڈاکٹر لارنس براؤن۔ ایک مُعجزے نے مُجھے حق کا راستہ دکھا دیا	96
12	ایلن رونی۔ اسکاٹ لینڈ میں اسلام کی کرن	100
13	علی پولوسِن۔ رُوسی ممبر پارلیمنٹ کے قبولِ اسلام کی داستان	103
14	جولین فرانسس داس۔ اور پھر میں نے اسلام قبول کر لیا	107
15	یوسف یُوحنا۔ پاکستانی کرکٹر محمد یوسف کا قبولَ اسلام	111
16	ٹیری ہولڈ بروکس۔ گوانتاناموکا محافظ مسلمان ہو گیا	116
17	جیمس گرانٹ۔ افغانستان میں امریکی فوجی کا قبولِ اِسلام	120
18	ڈینئل اسٹریچ۔ سوئس پارلیمنٹیرین اسلام کی جھولی میں آن گرا	123

نمبر شمار	مضامین فہرست	صفحہ نمبر
19	نر بہادور۔ ایک نیپالی جو اسلام کے نُور سے نہا گیا	130
20	ماکزینس بٹے۔ اسلام کی مخالفت اسلام کی قبولیت بن گئی	133
21	سائمن کولیز۔ سعودی عرب میں برطانوی سفیر نے اسلام قبول کر لیا	136
22	پرویز مسیح۔ آخر کار اسلام ہی میری منزل ٹھہری	140
23	ورنر کلاون۔ سابق رُکنِ پارلیمنٹ کا قبولِ اسلام	145
24	جوپال ایچان۔ ایک فلپائنی نو مسلم کی داستان	149
25	گوتم داس۔ ایک ہندو کے قبولِ اسلام کا واقعہ	155

ابتدائی کلمات

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا فرمایا تو اسے اشرف المخلوقات یعنی اپنی مخلوقات میں سب سے عظیم قرار دیا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا فرمائی کہ وہ اپنے لئے اچھے یا بُرے راستے کا انتخاب خود کرے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا تو ساتھ ہی کچھ احکام بھی صادر فرمائے۔ یہ احکام سلسلۂ نبوت کا آغاز تھے، یوں حضرت آدم علیہ السّلام پہلے نبی قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السّلام سے نسلِ انسانی کا آغاز کیا اور اُن کے ہاں ہر ولادت میں دو بچے پیدا ہوتے، دو بچوں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوتی تھی۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے سگے بہن بھائی قرار دیا، جبکہ دوسرے پیدا ہونے والے بچے اُن کے سوتیلے بہن بھائی قرار دیئے۔ جڑواں بہن بھائیوں میں شادی کی ممانعت کر دی۔ حضرت آدم علیہ السّلام کے بیٹے قابیل نے حکم سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی بہن قلیما سے شادی میں رغبت ظاہر کی اور پھر اسی وجہ سے ہابیل کو قتل کر دیا۔ یوں دُنیا میں اختلافات اور لڑائیوں کا آغاز ہو گیا۔ پھر حضرت ادریس علیہ السّلام کی وفات پر ایک عالم اسقلینیوس نے اپنا غم کم کرنے کیلئے اُن کا مجسمہ بنالیا۔ ان کی وفات کے بعد شیطان نے لوگوں کو وہ بت دکھا کر ورغلایا اور بت پرستی کا آغاز ہو گیا روئے زمین پر نسلِ انسانی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ پھر اختلافات بغاوت بننے لگے تو اللہ کی طرف سے طوفانِ نُوح آیا۔ اِس بعد مذہب اور فرقے بڑھتے گئے، کچھ قومیں اللہ کے غضب کا شکار بھی ہوئیں مگر زمانے بدلتے گئے۔ آسمانی مذاہب میں تین ادوار دینِ ابراہیمی، بنی اسرائیل اور دینِ اسلام قابلِ ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ انبیائے کرام مبعوث فرمائے، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اِس سلسلے کے آخری نبی تھے مگر یہود و نصاریٰ نے اختلاف کرتے ہوئے یہودی اور عیسائی دو علیحدہ مذہب بنا لئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو دینِ اسلام کو آخری دین، نبی محمد ﷺ کو آخری نبی اور قُرآن کو آخری کتاب قرار دیتے ہوئے پہلے سے موجود تمام مذاہب اور کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ مگر یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے مذہبوں اور کتابوں کو ردوبدل کیساتھ جاری رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے آخری دین اسلام، آخری کتاب قُرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور آخری نبی ﷺ کی سُنت پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی۔

دور کوئی بھی ہو، مسلمانوں کے اعمال کیسے ہی کیوں نہ ہوں، اللہ نے اپنے دین اسلام کا اِرتقاء جاری رکھا۔ آج کے دور میں جب سانحۂ نائن الیون، عراق امریکہ جنگ اور امریکہ افغان جنگ کی وجہ سے مسلمانوں کی کردار کشی کی جا رہی ہے، اسلام کا

ارتقاء جاری ہے۔ جتنی مخالفت اور نفرتیں بڑھائی جارہی ہیں اتنے ہی لوگ اسلام کی جانب اور راغب ہو رہے ہیں۔ یہ سب اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے کیونکہ وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔

یوں تو آپ کو یہ واقعات انٹرنیٹ پر پڑھنے کو مل جائینگے، مگر میں نے ہزارہا صفحات و واقعات کو کھنگال کر انہیں خوبصورت لفظوں کی مالا میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ واقعات میں تسلسل اور روانی کے ساتھ ساتھ کہانی کا سا انداز بھی نمایاں ہو، تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی برقرار رہے۔

کتاب "میں نے اسلام کیوں قبول کیا" کی جلد اوّل میں دُنیا میں ایسے مردوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں، جو یا تو اسلام کے انتہائی مخالف تھے یا پھر اپنے مذاہب کے عالم وراہب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک واضح پیغام ہے کہ انسان کی کوشش کیساتھ اللہ کی رضا بھی ضروری ہے۔ جب اللہ کی مرضی ہوتی ہے تو پھر ناقابلِ یقین واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اِس کتاب میں ایسے ہی نو مسلموں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ کون کیا تھا؟ وہ تو کسی کے بھی دلِ میں ایمان کی چنگاری دیکھ کر اُسے اسلام کی دولت سے سرفراز فرما دیتا ہے اور ہمارے لئے ایک سوچ پیدا کر دیتا ہے کہ لوگو دیکھو! میں ہی تمہارا رب ہوں اور میں جو چاہوں کر سکتا ہوں، چاہے وہ عمل تمہارے لئے ناممکنات میں ہو۔ اللہ کیلئے کچھ بھی ناممکن یا مُشکل نہیں ہے۔ وہ جب کہتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے۔

اُمید ہے قارئین کو میری یہ حقیر سی کاوش ضرور پسند آئیگی۔ مُجھ گنہگار کیلئے اللہ سے دُعائے خیر ضرور کیجیئے گا۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب

زاہد عرفان میاں

مارماڈیوک ویلیم پِکتھال

اِسلام قبول کرنیوالا قُرآن کا مُستند انگریزی مُترجم

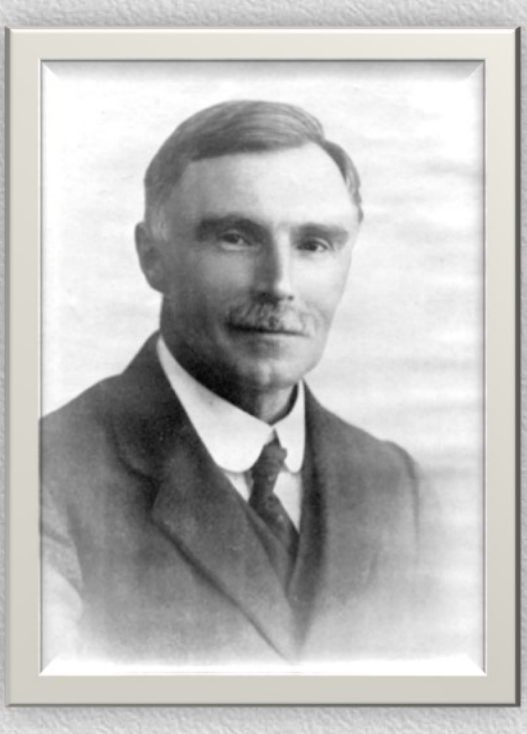

مارماڈیوک ویلیم پکتھال 7 اپریل 1875ء کو کیمبرج ٹیرس لندن، انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ آپ چارلس گرے سن پکتھال کے دو بیٹوں میں بڑے بیٹے تھے اور چارلس گرے سن پکتھال کی دوسری بیوی "میری ہیل" کی اولاد تھے۔

29 نومبر 1917ء کو وہ "مُسلم ادبی سوسائٹی نوٹنگ ہل، ویسٹ لندن" اسلام کی ترقی کے بارے میں خطاب کر رہے تھے۔ جِس میں اُنہوں نے ڈرامائی انداز میں خطاب کرتے ہوئے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔

1919ء کا واقعہ ہے کہ حکومتِ ہند کی "بمبئی کرانیکل" کے ایڈیٹر بی جی ہارنمین سے کچھ ناراضگی ہوگئی۔ کیونکہ اُس نے لارڈ ولنگڈن کے خلاف ہونے والے ایک احتجاج میں حصّہ لیا تھا جِس کی شکایت اُنہوں نے بمبئی کے گورنر لارڈ لائڈ سے کی اور اُس کی سبکدوشی اور جلاوطنی پر اصرار کیا۔ چنانچہ لارڈ لائڈ کے حکم سے بی جی ہارنمین کو زبردستی جہاز میں سوار کر کے انگلینڈ روانہ کر دیا۔ اب نئے ایڈیٹر کی تلاش ہوئی تو "محمد مارماڈیوک پکتھال کا انتخاب کیا گیا۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے 1920ء میں بمبئی

آ کر "بمبئی کرانیکل" کی ایڈیٹری سنبھال لی۔

محمد مارماڈیوک پکتھال نے اپنے منصب کو خوب نبھایا، جہاں تک کہ نظام دکن بھی اُن کی کارکردگی سے نہایت خوش تھے اور اُنہوں نے اپنی خوشی کا اظہار ایک ٹیلیگرام کے ذریعے کیا۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے تُرکی اور دُنیائے اسلام پر اپنے اخبار میں کثرت سے مضامین لکھے۔اِس پر اخبار "نیو انڈیا" نے احتجاج کرتے ہوئے حکومتِ ہند سے شکایت بھی کی، مگر محمد مارماڈیوک پکتھال نے انِ شکایتوں اور نکتہ چینیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مِشن کو جاری رکھا۔اُنہی ایام میں "بمبئی کرانیکل" کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اُسے "لوزان کانفرنس" میں ایشائی مبصر کے طور پر نمائندگی دی گئی، جسے مخالفین نے فضول خرچی قرار دیتے ہوئے حسبِ روایت احتجاج کیا مگر مارماڈیوک پکتھال نے یہ کہہ کر مُسترد کر دیا کہ ہندوستان کو شائستہ ممالک کی صف میں کھڑا ہونے کیلئے یہ سب کرنا ہو گا۔

1908ء کے انقلابِ تُرکی کے بارے میں اُنہوں نے ایک کتاب "دی ارلی آورز یعنی صُبحِ صادق" لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔ اِس سے قبل 1903ء میں وہ "سعید دی فشرمین" نامی کتاب لکھی تھی، جسے مُسلم حلقوں اور ناقدین نے تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ اِس میں اسلام کی صحیح تصویر پیش نہیں کی گئی۔مارماڈیوک ویلیم پکتھال نے وضاحت کی کہ یہ کتاب میں نے اسلام کے مشاہدے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے لکھی تھی۔اُنہوں نے بتایا کہ "دی ارلی آورز" کا مُجھے معاوضہ بہت کم ملا ،کیونکہ میں نے اُس میں تُرکی کے بارے میں اچھی تصویر کشی کی تھی جو اہلِ یورپ کیلئے کسی بھی طور قابلِ قبول نہ تھی۔

ایک دفعہ تُرک نوجوانوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو اُنہوں نے بتایا کہ میں نے ایک تُرک نوجوان غازی طلعت سے کہا کہ تُم یونہی غیر مسلح گھومتے پھرتے رہتے ہو، تمہیں تو حفاظت کیلئے مسلح محافظ ساتھ رکھنا چاہیے۔غازی طلعت نے کہا: کیا خدا سے بڑھ کر بھی کوئی محافظ ہے؟میرا ایمان کہتا ہے کہ وقت سے پہلے کبھی موت نہیں آسکتی، تو پھر میں محافظ ساتھ رکھ کر اپنے ایمان کیوں کمزور کروں؟ محمد مارماڈیوک پکتھال کہتے ہیں کہ اُس نوجوان کے ان الفاظ نے میرے ایمان کو اور مضبوط کر دیا۔اُن کا کہنا ہے کہ "مُسلمان کو اپنا ہر کا اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے"۔

ایک دفعہ اُن سے پوچھا گیا کہ اُن کے اسلام لانے میں خواجہ کمال الدین اور جماعت کا کتنا ہاتھ ہے؟ انہوں نے کہا: کہ خواجہ

کمال الدین میری کچھ اُلجھنوں کو دور کرنے کا سبب ضرور بنے اور اُنہوں نے میری سمجھ میں نہ آنیوالی باتوں کی ایسی تاویلیں پیش کیں کہ میری تمام اُلجھنیں دور ہو گئیں۔ مگر میرے مُسلمان ہونے کا سبب میرا مطالعہ ہے۔ میرے مطالعہ نے مُجھے اسلام کی راہ دکھائی۔ہاں یہ بات میں برملا کہوں گا کہ خواجہ کمال کی دینی خدمات سے میں از حد متاثر ہوا ہوں۔ اُن سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کی بیوی آپ کے ایما پر مسلمان ہوئی ہیں؟ تو اُنہوں نے کہا کہ میں نے اُن پر کوئی جبر یا دباؤ نہیں ڈالا۔ وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہوئی ہیں۔

محمد مارماڈیوک پکتھال نے خلافتِ عُثمانیہ(تُرک خلافت) کے متعلق یورپین ڈپلومیسی کے تعصبات کو ختم کرنے کیلئے تقریر و تحریر کا استعمال کیا۔1920ء میں اُنہوں نے "فارن آفیئرز" میں "قتلِ عام اور تُرک 'تصویر کا دوسرا رُخ" ایک طویل مضمون لکھا۔انہون نے شیخ سعدی کی کہانی "قلم در کف دشمن است" (قلم دُشمن کے ہاتھ میں ہے) پر نہایت دلآویز تحریر لکھی۔ انہوں نے اپنی تحریر میں لکھا "بات یہ نہیں کہ تُرک بُرے ہیں، لیکن قلم چونکہ دُشمن کے ہاتھ میں ہے، اِس لئے وہ ہمیشہ اُنہیں بُرے رنگ میں ہی پیش کرتا ہے"۔

1924ء میں کچھ وجوہات کی بنا پر اُنہوں نے "بمبئی کرانیکل" کو چھوڑ دیا۔کچھ عرصہ وہ سولومن گلیڈ اٹون کے ساتھ رہے جو اُن دنوں اسکول آف آرٹ بمبئی کے پرنسپل تھے۔ پھر اُنہیں نظام آف دکن نے حیدرآباد بلایا اور چادر گھاٹ ہائی اسکول کا ہیڈماسٹر مقرر کر دیا اور ساتھ ہی اُنہیں ریاست کی سول سروس کا اتالیق مقرر کر دیا۔کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے دوسال کی چُھٹی لے لی اور مصر چلے گئے، وہاں اُنہوں نے قُرآنِ پاک کا انگریزی ترجمہ مکمل کیا۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے اپنی تمہید میں یہ بات لکھ دی تھی:"وہ شخص جو کسی مقدس کتاب کے الہامی ہونے کا قائل نہ ہو وہ اِس کے ترجمے کیساتھ کبھی بھی انصاف نہیں کر سکتا"۔ عیسائی اِس بات پر بڑا تلملائے کیونکہ اِس سے پہلے عیسائی مبلغین "پامر، راڈویل اور سیل" وغیرہ کے انگریزی ترجمے رائج تھے۔

عیسائیوں نے محمد مارماڈیوک پکتھال کے ترجمہ سے کچھ غلطیاں نکال کر مُسلم دشمن رسالے "مُسلم ورلڈ" میں چھاپ دیں۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے عیسائیوں کی باتوں کی پرواہ نہیں کی۔ محمد مارماڈیوک پکتھال کا یہ انگریزی ترجمہ والا قُرآن

1930ء میں شائع ہوا۔ چند دوستوں نے طباعت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ اِس کا دوسرا ایڈیشن غلطیوں کی دُرستگی کیساتھ شائع کیا جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ میری زندگی میں شائد ہی ایسا ہو سکے۔

کچھ مسلمان دوستوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔ میرے دل میں اسلام کی بڑی قدر ہے کیونکہ میں نے اسلام تحقیق کرنے کے بعد قبول کیا ہے، جبکہ آپ لوگوں کے جذبوں میں میرے جیسی شدت نہیں ہے کیونکہ آپ پیدائشی مسلمان ہیں۔ میں یہ نعمت ملنے پر اللہ جل وجلالہ کا جس قدر بھی شُکر ادا کروں کم ہے۔

اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مارماڈیوک پکتھال نے بتایا: میری عمر اٹھارہ برس تھی جب میں سیر وسیاحت کے شوق میں اسلامی دُنیا کی جانب نکلا۔ فلسطین پہنچا تو کچھ عرصہ وہیں رُک رہا اور مسجدِ اقصیٰ میں شیخِ جامعہ سے عربی سیکھنے لگا۔ ایک دن میں نے شیخ صاحب سے تبدیلیٔ مذہب کا اشتیاق ظاہر کیا۔ شیخ صاحب ضعیف عُمر اور تجربہ کار تھے۔ وہ بولے: اے نوجوان! شائد یہ نوجوانی کا ولولہ ہے، بہتر ہو گا کہ تم اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کر لو۔ مارماڈیوک پکتھال کہتے ہیں کہ میں شیخ صاحب کی بات سُن کر بڑا حیران ہوا۔ کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کیلئے بیتاب رہتے ہیں۔ شیخ صاحب سے گفتگو نے تو میری رائے بدل کر رکھ ڈالی۔ "اہلِ مغرب تو خوامخواہ مسلمانوں کو متعصب سمجھتے ہیں" کچھ عرصہ بعد میں نے طلعت پاشا سے کہا: میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا، تم اسلام قبول کر لو مگر قسطنطنیہ میں اِس کا اعلان نہ کرنا، ورنہ ہم بین الاقوامی مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایک عرصہ کے بعد یہ اعلان لندن میں کیا۔ مارماڈیوک پکتھال نے قبولِ اسلام کے اعلان پر لندن کے علمی و ادبی حلقوں میں ہلچل سی مچ گئی، جبکہ بہت سے عیسائی دانشوروں اور معززین کا کہنا تھا کہ: "جِس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کر سکتا ہے ، وہ مذہب ضرور اچھائیوں کا حامل ہو گا"۔

محمد مارماڈیوک پکتھال کے "علی برادران" سے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ بمبئی کرانیکل میں کام کے دوران جب وہ چھٹی لیکر انگلستان گئے، تو اُنہوں نے کراچی جیل میں اُن سے مُلاقات کی تھی اور بیان شائع کیا "دونوں بھائی جیل میں بہت خوش ہیں اور جیل کے افسران سے بھی اُنہیں کوئی شکایت نہیں ہے" اُن دنوں بمبئی میں یہ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ علی برادران سے

جیل میں بہت بُرا سلوک کیا جارہا ہے، اسی وجہ سے وہ انگلستان جاتے ہوئے اُن سے مل کر گئے تھے۔

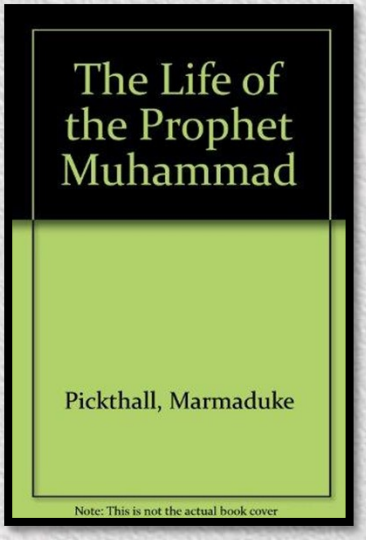

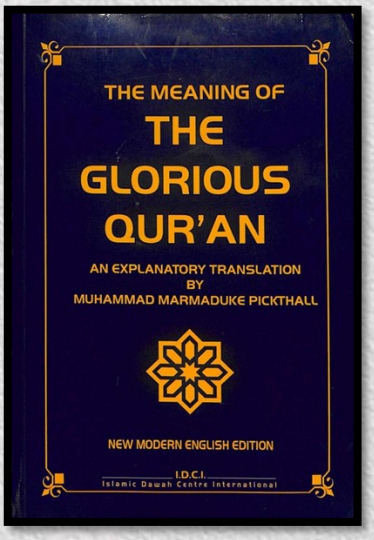

محمد مارماڈیوک پکتھال کی اہم تصنیفات

محمد مارماڈیوک پکتھال نے قبولِ اسلام کے اعلان سے قبل سولہ اور چھ کتابیں بعد میں لکھیں۔ ان کتابوں میں "سعید دی فشرمین، دی ہاؤس آف اسلام، دی ہاؤس ایٹ وار، دی ارلی آورز، دی لائف آف پرافٹ محمد، اور سب سے اہم یہ کہ اُنہوں نے قُرآن پاک کا مستند ترجمہ کیا جسے اہلِ اسلام نے پسند اور قبول کیا اور آج بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال کی سرے، انگلینڈ میں آخری آرامگاہ

محمد مارماڈیوک پکتھال 19 مئی 1936ء کو انگلینڈ میں انتقال کر گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ اُن کی موت ہسپانیہ (اسپین) میں ہو، جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی تھی اور اُس اسلامی دور سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اللہ اُنہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

لیوپولڈ ویز

یہودی نوجوان کی ایمان افروز کہانی

محمد اسد یہودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا نام لیوپولڈ ویز تھا۔ اُن کے دادا ایک یہودی عالم تھے۔ والدین کی خواہش تھی کہ وہ سائنسدان بنیں، مگر انہوں نے سیاحت اور صحافت کے پیشے اپنائے۔ اپنی منتخب راہ پر چلتے ہوئے وہ اسلام کی راہ پر چل نکلے اور مسلمان ہو گئے۔ اُنہوں نے پاکستان کی شہریت اختیار کی۔ وہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، قائدِ اعظم محمد علی جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے قریب رہے۔ پاکستان کی سیاست میں داخل ہوئے، مگر اُس وقت کی بیوروکریسی کے ہتھکنڈوں سے نالاں ہو کر کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنا باقی وقت پڑھنے لکھنے میں گذارا۔ اُن کا انتقال 1992ء میں اسپین کے شہر گرناڈا میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ 2008ء میں اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے آسٹریا میں ویانا کی شہری حکومت نے اقوامِ متحدہ کے دفتر کے سامنے ایک پارک کو اُن کے نام سے منسوب کیا ہے۔

لیوپولڈ ویز آسٹریا کے شہر "لیمبرگ" میں پیدا ہوئے۔ لیمبرگ اِس وقت "لوو" کے نام سے پولینڈ میں واقع ہے۔ اُن کا تعلق ایک یہودی ربی خاندان سے تھا۔ لیوپولڈ کے دادا ایک یہودی عالم "ربی" تھے، جو سفید لانبی داڑھی کیساتھ ایک رُعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ لیوپولڈ ویز کا کہنا تھا کہ اُن کے دادا کو طبیعات سے جنون کی حد تک عشق تھا، اِس لئے وہ چاہتے تھے کہ اُن کا بیٹا سائنسدان بنے۔ دادا کی یہ بھی خواہش تھی کہ نسل در نسل چلی آنیوالی خاندانی وراثت کے تحفظ کیلئے وہ ربی بنیں۔ غالباً اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ اُن کے تایا جو ربی تھے۔ اُنہوں نے یہودیت ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ لیوپولڈ ویز کے والد "اکیواویز" اپنے باپ کی خواہش پر تلمود (یہودیوں کے دینی احکام کی کتاب) سیکھنے لگے مگر ساتھ ہی وہ دنیاوی تعلیم میں بھی مگن رہے۔ یہ بات اُنہوں نے اپنی ماں کو بتادی تھی۔ بائیس برس کی عمر میں جب اُنہوں نے بی اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو اُن کی ماں نے یہ خبر باپ کو بھی سنادی۔ لیوپولڈ ویز کے دادا یہ خبر سُن کر نہایت غمگین ہوئے مگر پھر بیٹے کی خوشی پر راضی ہو گئے۔ اُنکے والد گھر کے اقتصادی حالات کے سبب طبیعات کی تعلیم تو جاری نہ رکھ سکے البتہ حالات سے نپٹنے کیلئے اُنہوں نے وکالت پاس کر لی۔

لیوپولڈ ویز کے والد اکیواویز نے وکالت کی ڈگری لینے کے بعد "لوو" شہر میں سکونت اختیار کر لی اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اکیواویز نے وہیں پر شادی کر لی۔ اُن کی بیوی کا باپ ایک دولتمند بینکر تھا۔ 12 جولائی 1900ء کو اکیواویز کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو اُس کا نام لیوپولڈ رکھا اور خاندانی نام "ویز" کیساتھ اُنہیں لیوپولڈ ویز پکارا جانے لگا۔ لیوپولڈ ویز اپنے والدین کا دوسرا بیٹا تھا۔ لیوپولڈ ویز اپنی کہانی یوں بیان کرتے ہیں:

میرا خاندان ایک مذہبی یہودی گھرانہ تھا اور میرے دادا ایک ربی (یہودی عالم) تھے۔ میرے تایا کو اُنہوں نے اپنے خطوط پر چلانے کی کوشش کی، مگر اُنہوں نے عیسائی عورت سے شادی کر کے عیسائیت اختیار کر لی۔ دادا کی پوری توجہ اب میرے باپ کی جانب مرکوز ہو گئی۔ میرے والد صاحب نے دینی تعلیم کیساتھ دُنیاوی تعلیم بھی جاری رکھی اور پھر وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ دادا چاہتے تھے کہ میں طبیعات کی تعلیم حاصل کر کے سائنسدان بنوں اور ساتھ ہی مذہب کی جانب بھی رجحان رہے۔ میں تیرہ سال کا تھا جب اُنہوں نے مجھے ایک دینی اقامت گاہ میں داخل کروادیا۔ میں نے بہت کم عرصے میں نہ صرف عبرانی زبان سیکھ لی، بلکہ بڑی روانی سے بولنے بھی لگا۔ میں نے عہدِ قدیم کی تلمود کا مطالعہ کیا تھا اِس لئے تلمود بائیبل اور تلمود قدس

کے بارے میں آسانی سے بحث کر سکتا تھا۔ اور میں نے تار غوم (یہودیوں کی مذہبی کتاب) بھی پڑھ لی۔ میں اپنے دین کی جانب سے پابندیوں اور احکامات کی زنجیر سے بندھا ہوا تھا، مگر میری نوجوانی اور لڑکپن نے بڑی آسانی سے مجھے اس زنجیر سے آزاد کروالیا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

1914ء کا سال ختم ہونے کو تھا کہ پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ میری جوانی نے جوش مارا تو مدرسہ سے فرار ہو کر آسٹرین فوج کے بھرتی کیمپ پہنچ گیا اور اپنا نام بدل کر بھرتی ہو گیا۔ فوج میں بھرتی کیلئے عمر اٹھارہ سال ہونا لازم تھی جبکہ میں تو ابھی چودہ سال کا تھا مگر میرے دراز قد اور جسمانی ساخت نے عُمر کو چھپالیا اور میں اٹھارہ سال کا بتا کر بھرتی ہو گیا۔ میرے والد کو جب پتہ چلا تو وہ پولیس کیساتھ وہاں پہنچ گئے اور میری کم عمری کے ثبوت دیکر مجھے فوج سے برخاست کروا کر گھر لے گئے۔ چار سال بعد میری عُمر اٹھارہ سال ہوئی تو میں دوبارہ آسٹرین فوج میں چلا گیا۔ چند ہی ہفتوں بعد انقلاب آ گیا اور آسٹریا میں شہنشاہیت اختتام پذیر ہوئی اور ساتھ ہی پہلی جنگِ عظیم بھی ختم ہو گئی۔

شہنشاہیت ختم ہونے سے فوج بھی تتر بتر ہو گئی اور میں ایک دفعہ پھر فوج سے باہر آ گیا۔ میں نے ویانا یونیورسٹی سے دو سال میں فلسفہ اور آرٹ کی تعلیم مکمل کر لی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد متاثرہ ملک اقتصادی اور اخلاقی طور پر بے راہ روی کا شکار ہو گئے تھے۔ میں اِن حالات سے سخت نالاں تھا۔ 1920ء میں گرمیوں کا موسم تھا۔ میں والد کو بتائے بغیر گھر چھوڑ کر ریلوے اسٹیشن پہنچا اور ٹرین میں سوار ہو کر پراگ جا پہنچا۔ میرے سفری اسباب میں ذاتی استعمال کی چیزیں اور ایک ہیرے کی

انگوٹھی تھی جو میری مرحوم ماں سے وراثت میں ملی تھی۔ پراگ پہنچ کر میں نے وہ انگوٹھی فروخت کر دی تاکہ اپنی روزمرہ ضروریات کو پورا کر سکوں۔ دوستوں کے مشورے سے حصولِ روزگار کیلئے میں برلن چلا گیا۔

چند ماہ میں روزگار کیلئے تگ و دو میں لگا رہا یہاں تک کہ میری جمع شدہ پونجی بھی ختم ہو گئی اور نوبت بھوک اور فاقوں تک آ پہنچی۔ میری مکان مالک مجھے کھانا دیدیتی اور میں چائے پر گذارہ کرتا رہا۔ پھر قسمت نے پلٹا کھایا اور مجھے ایک دوست کے توسط سے مشہورِ زمانہ فلم پروڈیوسر ایف ڈبلیو مورنو تک رسائی ہوئی۔ اُس نے مُجھے عارضی طور پر اپنا معاون منتخب کر لیا۔ یہ ملازمت ختم ہوئی تو ایک دوست کیساتھ مل کر فلم اسکرپٹ لکھے۔ حالات نے مُجھے یہ سبق بھی سکھا دیا تھا کہ اپنے اچھے دنوں میں آنیوالے برے وقت کو مت بھولو۔ چنانچہ میں نے اپنی آمدنی اور اخراجات میں احتیاط برتی۔

1921ء کا سال میری بدحالی سے شروع ہوا۔ ایک شام میں تھکا ماندہ مایوس بیٹھا ہوا تھا کہ میرا ایک دوست ملنے آ گیا۔ میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے اُس نے کہا: لیو پولڈ! اگر تم پسند کرو تو میں یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کے ذیلی ادارے یونائیٹڈ ٹیلیگراف میں تمہیں متعارف کروا دیتا ہوں۔ یہ نئی نیوز ایجنسی ہے اور بہت جلد اُنہیں سب ایڈٹرز کی ضرورت پڑے گی۔ میں نیوز ایجنسی گیا تو اُنہوں نے عارضی طور پر مجھے ٹیلی فون کے ذریعے خبریں اخبارات تک پہنچانے کیلئے ملازم رکھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک دوست کے توسط سے یہ خبر ملی کہ روس کے مشہور افسانہ نگار میکسم گورکی کی بیوی برلن آ رہی ہے اور یہ خبر پوشیدہ رکھی جا رہی ہے۔ میکسم گورکی اُن دنوں روس میں اُٹھنے والی ایک بڑی تحریک چلا رہا تھا۔ قسمت نے میری مدد کی کہ میں نے ایک گردش کرتی ہوئی خبر سنی کہ میکسم گورکی کی بیوی اِس تحریک کو موثر بنانے کیلئے یورپ کے دورے پر آ رہی ہے تاکہ وہ رائے عامہ کو تحریک کے حق میں ہموار کر سکے۔ یہ خبر میری زندگی میں انقلاب برپا کر سکتی تھی۔ اب میں اِس کھوج میں رہنے لگا کہ مادام گورکی کا کچھ سراغ ملے تو میں اُس سے ملوں۔

میرا ایک دوست اُن دنوں برلن کے ایک مشہور ہوٹل سپلینڈ میں نائٹ سکیورٹی گارڈ کا کام کرتا تھا۔ ایک روز مُجھ سے ملا تو بولا: ارے یار لیو پولڈ! یہ مادام گورکی بڑی لطیف مزاج اور دلچسپ عورت ہے۔ مادام گورکی کا نام سُن کر میں چونک گیا اور پوچھا۔ تم نے اُسے کہاں دیکھا؟ میری دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولا: کل شام وہ ہمارے ہوٹل میں آئی ہے اور نام بدل کر اُس نے کمرہ حاصل کیا ہے۔ یہ بات صرف ہوٹل مینجر جانتا ہے یا پھر تیرا دوست اِس بھید سے واقف ہے۔

مادام چاہتی ہیں کہ اخباری رپورٹرز اُس کو تنگ نہ کریں۔

مگر یار! تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ وہ ہنستے ہوئے بولا: پیارے دوست یہ ہماری نوکری کا حصّہ ہے، اگر ہم یہ نہ کریں تو نوکری زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ اچھا یار: معلومات دینے کا شکریہ! اب میں کوئی ملنے کی سبیل نکالتا ہوں۔ میری بات سن کر وہ بولا: دیکھو دوست! میرا نام نہ آئے، ورنہ نوکری خطرے میں پڑ جائیگی۔ میں نے رازداری کا وعدہ کر لیا اور اُسی وقت یونائیٹڈ ٹیلی گراف کے دفتر پہنچا تو ہنگامہ خیز کہانی لانے کیلئے بڑی مشکل سے نیوز ایڈیٹر کا پریس کارڈ حاصل کیا۔ میں ہوٹل پہنچا اور کچھ گھنٹے انتظار میں گذارے۔ نصف شب کے قریب میرے دوست نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔ سیاہ پوشاک زیبِ تن کئے لانبے قد کی درمیانی عمر کی عورت بڑی شانِ بڑی نیازی سے چلے جا رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا اُس کے قریب پہنچا اور سرگوشی کے انداز میں پکارا: مادام گورکی! اُس عورت نے پہلے میری جانب دیکھا اور پھر اپنی اطراف میں دیکھتے ہوئے بولی: میں مادام گورکی نہیں ہوں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے فوراً پریس کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ میری معلومات غلط نہیں ہیں، آپ نہیں جانتی کہ آپ کا تھوڑا سا وقت میری زندگی میں ایک انقلاب لا سکتا ہے۔ وہ مُسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی: میں ہی مادام گورکی ہوں، آؤ کمرے میں چلتے ہیں۔ کمرے میں ہم نے چائے پی اور اِس دوران میں مادام سے انٹرویو کے سوال کرتا رہا۔

مادام سے رُخصت ہو کر میں سیدھا اپنے دفتر پہنچا۔ ڈیوٹی پر موجود سب ایڈیٹرز نے مجھے بڑی حیرت سے دیکھا مگر میں اُنہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دفتر پہنچا۔ جلدی سے جیب سے کاغذات کا پلندہ نکالا اور رپورٹ مرتب کر کے ایڈیٹر سے اجازت لئے بغیر پریس کے ممبر اخبارات کو بھیج دی۔ دوسرے روز یونائیٹڈ ٹیلی گراف کے حوالے سے مادام گورکی کا انٹرویو اخبارات کے پہلے صفحے پر شائع ہوا تھا۔ اُسی روز ادارے کے سربراہ ڈاکٹر ڈامرٹ نے سب ایڈیٹرز کے اجلاس میں مجھے مدعو کیا اور میری پزیرائی کرتے ہوئے مجھے رپورٹر کا عہدہ دیدیا۔ یوں میں ایک جرنلسٹ بننے میں کامیاب ہو گیا۔

جنگِ عظیم ختم ہوئی تو یورپ شدید انتشار اور اقتصادی بحران کی زد میں آ گیا۔ معشیت، کارخانے اور زراعت تباہ ہو چکی تھی۔ تباہ شدہ معشیت کو سہارا دینے کیلئے یورپ میں دوبارہ سے تعمیراتی عمل شروع ہو گیا۔ 1922ء میں موسمِ بہار کی ایک شام مُجھے اپنے ماموں "ڈوریان" کا خط موصول ہوا۔ ڈوریان سے میرا رشتہ ماموں بھانجے سے زیادہ دوستی کا تھا۔ ڈوریان ماموں مشہورِ

زمانہ ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کے شاگرد تھے اور یروشلم میں دماغی امراض کے ہسپتال میں ایک ذمہ دار آفیسر تھے۔ وہ شادی کے جھنجٹ میں پڑے بغیر تنہا زندگی گذار رہے تھے۔ اُنہوں نے ویانا میں ماضی کی یادوں کو کریدتے ہوئے مجھے لکھا: لیوپولڈ ویز! تم چند ماہ کیلئے میرے پاس چلے آؤ تاکہ ہم کچھ اور وقت اچھے ڈھنگ سے گذار سکیں۔ اخراجات کیلئے پریشان مت ہونا، میں سب انتظام کرلوں گا۔ میرا گھر پتھروں سے بنا ہوا ہے اور گرمیوں میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے اور پھر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے جو یقیناً تمہارے لئے باعثِ راحت ہو گا۔

میں نے اُسی وقت روانگی کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنا سامان سمیٹا اور دوسرے روز دفتر پہنچ کر ڈاکٹر ڈامرٹ کو اطلاع دی کہ مجھے کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر مشرقِ وسطیٰ جانا ہے۔ آپ ایک ہفتے میں میرا متبادل تلاش کرلیں۔ میں نے سفر کیلئے بحری جہاز کی ٹکٹ حاصل کی اور پھر ایک دن میرا یہ جہاز منزل کی جانب محوِ سفر تھا۔ ہمارا پہلا پڑاؤ رومانیہ کی بندرگاہ کونسٹازہ تھی۔ رومانیہ کی بندرگاہ سے جہاز نے لنگر اُٹھایا تو ایک کُہر آلود صُبح تھی۔ میں عرشے پر کھڑا نظارہ کر رہا تھا۔ پھر اچانک مطلع کچھ بہتر ہوا اور پانی پر پڑنے والی سورج کی کرنیں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔

اچانک ایک بھاری سی آواز نے مجھے چونکا دیا: صبح بخیر مسٹر لیوپولڈ! میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ فادر فیلکس تھے جو میرے ہم سفر تھے۔ یہ فرانسیسی نژاد پولش تھے اور مسیحی پادری تھے۔ وہ اسکندریہ کے کالج میں تاریخ کے اُستاد تھے۔ اُن کی صُحبت میں سفر بڑا اچھا گذرا۔ فادر فیلکس مُجھے عیسائیت کے بارے میں لیکچر دیتے رہے، پھر وہ مذہب میں میری عدم دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے کہنے لگے: معاف کیجئے گا، میں نے تبلیغ شروع کر دی، حالانکہ میرے اور آپ کے عقائد بالکل مختلف ہیں۔

میں نے اُن کی بات سُن کر کہا: فادر فیلکس! عقیدہ ہو تو اختلاف بھی ہوتا ہے، میرا تو کوئی عقیدہ ہی نہیں ہے۔ وہ بولے: ایمان سے عدم دلچسپی ہماری بنیادی کمزوری ہے۔ اسی بنا پر ہم زمانے کے پیچ و تاب میں پھنسے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ بار بار ایمان کی بات کر رہے ہیں، میں آپ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ فادر فیلکس بولے: لیوپولڈ! ایمان کا محور عبادات اور عبادات کا محور خالقِ کائنات ہے۔ میں نے کہا: فادر فیلکس! اگر کوئی شخص عبادت کرتا ہے تو اِس کا مطلب یہی ہے کہ وہ خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہے اور جب وہ خدا پر یقین رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اِس کا سبب مذہبی رُجحان ہی ہے۔ فادر فیلکس میرے جوابات سے مایوس ہو کر کہنے لگے اگر آدمی قدرتِ خداوندی سے مستفید ہونے سے قاصر ہو تو اُسے چاہیئے کہ دوسروں کے

تجربات سے استفادہ کرے۔

بحری جہاز کا سفر ختم ہوا تو ہماری رفاقت بھی ختم ہو گئی۔ منزل پر پہنچنے کیلئے اب میں نے ٹرین کا سفر اختیار کیا۔ رات کا وقت تھا اور ٹرین صحرائے سینا سے گذر رہی تھی صحرا میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے اور ٹرین کے پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ کا مسلسل شور کی وجہ سے میری آنکھ نہ لگ سکی۔ آہستہ آہستہ دن کا اُجالا نمودار ہونے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر ریت کے ٹیلے، جھاڑیاں اور درخت نظر آنے لگے تھے۔ میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی تو سامنے والی سیٹ پر ایک بدو بیٹھا ہوا تھا، اُس نے بڑی سی عبا پہنی ہوئی تھی اور سر پر مفلر لپیٹے ہوئے تھا۔ ٹرین کے ڈبے میں صحرا کی ٹھنڈی ہوا سی سردی کا احساس ہو رہا تھا اور میرے سامنے بیٹھا بدو سردی سے کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنے گھٹنوں پر تلوار رکھی ہوئی تھی جس کی نیام پر سونے سے کیا ہوا کام چمک رہا تھا۔

منزل کی جانب رواں دواں ٹرین کے دائیں جانب صحرا اور بائیں طرف سمندر تھا۔ میں دونوں جانب کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک اسٹیشن پر ٹرین رُکی تو میرے سامنے بیٹھا بدو اُٹھا اور باہر سے جا کر روٹی خرید لایا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھ پر نگاہ پڑی تو روٹی کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے ایک میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے تعجب سے اُسے دیکھا تو اُس نے اپنی زبان میں کچھ کہتے ہوئے روٹی کا ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے مُتعجب دیکھ کر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا: یہ کہہ رہا ہے کہ ہم دونوں ایک ہی راستے کے مسافر ہیں تو کیوں نہ مل کر کھانا کھائیں۔ اگرچہ یہ معمولی سی بات تھی مگر میں عربی بدو کے اخلاق سے بیحد متاثر ہوا۔ عربی بدو کے اِس عمل میں مجھے انسانیت کی ایک ایسی جھلک نظر آئی جو ہر نمود و نمائش اور تکلف سے پاک تھی۔

ٹرین کچھ دیر بعد غزہ کے اسٹیشن پر رک گئی۔ ریت کے ٹیلوں کے درمیان ایک قدیم قلعہ کی عمارت نظر آرہی تھی۔ عربی بدو نے سامان سمیٹا اور مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا اور ڈبے سے باہر نکل گیا۔ باہر دو عربی بدو کھڑے تھے، اُنہوں نے استقبال کرتے ہوئے میرے ہمسفر بدو کو گلے لگایا اور گالوں پر بوسہ لیا۔ یہ رشتوں کے تقدس اور پیار کا ایک نہایت ہی خوبصورت منظر تھا جو میں کبھی بھی بھول نہیں پایا۔ میرا دوسرا ہمسفر مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ارد گرد کے ماحول کے بارے میں بتاتا رہا۔ ریل گاڑی یروشلم پہنچی تو ہم دونوں گرمجوشی سے ملتے ہوئے رُخصت ہوئے اور میں اپنے ماموں

ڈوریان کے گھر پہنچ گیا۔

ماموں کام پر ہوتے تو میں اپنے اِرد گرد کے ماحول سے آشنائی کی کوشش میں لگا رہتا۔ اسی ٹوہ میں رہنے کے سبب مجھے پتہ چلا کہ یہ مکان ایک بوڑھے عربی کی ملکیت تھا اور لوگ اُسے حاجی صاحب کہتے تھے۔ حاجی صاحب باربرداری کیلئے گدھے کرائے پر دیتے تھے، اسی وجہ سے صبح سویرے آس پاس کے کاشتکار اپنی سبزیاں اور پھل اونٹوں پر لاد کر لاتے اور حاجی صاحب کی قیامگاہ کے صحن میں ڈال دیتے۔ یہاں سے یہ چیزیں گدھوں پر لاد کر شہر کے بازاروں اور تنگ گلیوں میں سپلائی کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے اور کھانا اکٹھے زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اُن کی سادگی میں بھی شاہانہ وقار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہ صحن میں ہی صفیں باندھ کر حاجی صاحب کی اقتداء میں نماز ادا کرتے۔ مُجھے یہ منظر عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔

ایک روز میں نے حاجی صاحب سے پوچھا: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خُدا آپ کے رکوع و سجود کا منتظر ہوتا ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ بندہ تنہائی میں بیٹھ کر سکونِ قلب سے عبادت کرے اور دُعا مانگے۔ حاجی صاحب مسکرا کر بولے: جیسے ہمارا اللہ، ہمارا دین، ہمارا نبی (ﷺ) اور ہماری کتاب (قُرآن) ایک ہے، اسی طرح اللہ نے ہماری عبادات کا محور (بیت اللہ) بھی ایک ہی مقرر فرمایا ہے اور ہم سب مسلمان یکجہتی کیلئے کیلئے اسی جانب رُخ کر کے اجتماعی نماز ادا کرتے ہیں کیونکہ اللہ کا یہی حکم ہے۔ حاجی صاحب نے یہ سب کچھ مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس نے میرے بند دریچے کو کھول دیا تھا۔ اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اسلام ہی میرا دین بنے گا۔ چٹائیوں پر کھڑے لوگ، ننگے پاؤں سروں کو ڈھانپے ہوئے "اللہ اکبر" کی صدا پر ایک نظم کیساتھ رکوع و سجود کرتے ہوئے اپنی نماز مکمل کرتے تو مجھے عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اذان ہوتے ہی لوگ اگر گھر یا مسجد سے دور ہوتے تو وہیں صف بندی کر کے یا پھر انفرادی طور پر ماحول اور شور شرابے سے بے نیاز ہو کر نماز ادا کر لیتے تھے۔

ایک شام میں گھر بیٹھا کاغذات دیکھ رہا تھا کہ یونائیٹڈ ٹیلیگراف کا پریس کارڈ ملا۔ کارڈ دیکھ کر میری رگِ صحافت پھر بھڑک اُٹھی۔ یہ 1922ء کے آخری مہینوں کی بات ہے، اُن دنوں جرمنی افراطِ زر کا شکار تھا۔ میں نے مختلف اخباروں میں ملازمت کیلئے درخواستیں دیں۔ متعدد اداروں کی جانب سے مجھے انکار موصول ہوئے۔ ایک روز اچانک مجھے فرینکفرٹر ذئٹنگ اخبار کی

جانب سے ملازمت کی مشروط پیشکش موصول ہوئی۔ اُنہوں نے کہا مجھے جرمنی واپسی پر اُنکے کیلئے کتاب لکھنا ہو گی۔ معاوضہ نہایت قلیل تھا اور ادائیگی بھی جرمن کرنسی میں کی گئی۔ مگر یہ بات قابلِ فخر تھی کہ میں ایک ممتاز جرمن اخبار کا نمائندہ بن گیا۔

1923ء میں اخبار کی جانب سے مجھے مصر جا کر حالات کا جائزہ لینے کیلئے کہا گیا اور ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ فرینکفرٹر ذئٹنگ کا دائرۂ عمل اور وسیع کیا جائے۔ مصر میں اُن دنوں فلسطینی عربوں اور یہودیوں میں برطانوی حکومت کی دورُخی پالیسیوں کی وجہ سے ہنگامے ہو رہے تھے۔ ماموں ڈوریان نے مالی تنگدستی کے باوجود مجھے کچھ رقم دیدی، جو ریل گاڑی کے ٹکٹ کے علاوہ میرے پندرہ روز کے قیام وطعام کیلئے کافی تھی۔

قاہرہ پہنچ کر میں نے رہائش کیلئے تگ ودو کی تو ایک تنگ سی گلی میں مکان مل گیا۔ مکان کی مالکہ ایک عُمر رسیدہ اور جلد متاثر ہونیوالی خاتون تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہم میں اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ یروشلم سے چلتے ہوئے میرے دوست ڈاکٹر یعقوب ڈی ہان نے ایک تعارفی خط دیا تھا۔ میری جمع پونجی ختم ہو رہی تھی اس لئے میں مشاورت کیلئے خط لیکر اُس شخص کے پاس پہنچا۔ خط پڑھ کر اُسے پتہ چلا کہ میں فریکفرٹر ذئٹنگ کا نامہ نگار ہوں۔ میں نے اُسے اپنے لکھے ہوئے کچھ مضامین دکھائے، اُنہیں پڑھ کر اُنہوں نے مجھے حیرت دیکھا اور پوچھا: تمہاری عمر کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میں بائیس سال کا ہوں۔ وہ بولے: ان مضامین کو لکھنے کیلئے تمہارا معاون کون ہے؟ میں نے ہنستے ہوئے اُنہیں بتایا کہ میں اپنا کام خود کرنے کا عادی ہوں مگر آپ کو یہ شک کیوں ہوا؟ وہ حیرت زدہ ہو کر کہنے لگے: تمہاری تحریروں کی پختگی اور انداز تمہاری عُمر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اُنہوں نے مجھے ایک خط دیتے ہوئے کہا کہ تم اِس کمپنی میں چلے جاؤ تو تمہیں ملازمت مل جائیگی۔

میں تعارفی خط پر لکھے ہوئے پتے پر پہنچا تو ایک مصری بوڑھے سے ملاقات ہوئی جو کمپنی کا مالک تھا۔ اُس نے مجھے تین گھنٹے روزانہ پر منشی رکھ لیا۔ تنخواہ بڑی معمولی تھی مگر گذر اوقات کیلئے فی الحال یہی کافی تھی۔ یہ کمپنی کا دفتر میری رہائش سے کافی نزدیک تھا۔ میرے گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ جس کے مینارہ پر سفید عمامہ باندھے ایک شخص پانچ وقت اذان دیتا تھا۔ جس سن کر اُسکے جوشِ ایمانی کا اندازہ ہوتا تھا۔ قاہرہ میں میرا قیام 1923ء کی گرمیوں تک رہا۔ مشرقِ وسطیٰ کی زندگی اور سیاست کو سمجھنے کے بعد میں واپس یروشلم (بیت المقدس) آگیا۔

یروشلم میں ملازمت کیلئے ڈاکٹر یعقوب ڈی ہان نے میری مدد کی۔ اُن کے توسط سے مجھے ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے دو اخبارات میں ملازمت مل گئی۔ یہ دونوں چھوٹے اخبار تھے اور مجھے ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کی کرنسی میں معاوضہ دیتے تھے، جو زیادہ تو نہ تھا مگر میری سادہ زندگی کیلئے کافی تھا۔ بیت المقدس میں میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو دمشق میں اُستاد تھے۔ اُن سے میری دوستی ہو گئی۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ اگر کبھی دمشق آنا ہو، تو مجھے شرفِ میزبانی ضرور بخشنا۔

میں نے زندگی میں آگے بڑھنے کیلئے دمشق جانے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایک روز میں دمشق جا پہنچا۔ تنگ گلیوں میں ایک چھوٹے بچے کی معاونت سے میں مطلوبہ پتے پر جا پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر آجانے کی آواز سنائی دی۔ میں دروازہ کھول کر اندر آیا تو خود کو گھر کے صحن میں پایا، جس کے اطراف میں انگوروں سے لدے ہوئے درخت لگے تھے۔ میرے دوست نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ دمشق میں رہ کر میں نے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ ایک جمعہ کے روز میرا دوست مجھے اموی دور کی بنی ہوئی جامع مسجد لے گیا۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ مسجد کے چھت میں بنے ہوئے روشندانوں سے روشنی کی کرنیں سنگِ مرمر کے ستونوں پر پڑ رہی تھیں اور مسجد مُشک کی خوشبو سے معطر تھی۔ کچھ ہی دیر میں نماز شروع ہوئی تو سینکڑوں لوگ امام کی صدا پر رکوع و سجود کر رہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے اُنکی خُدا اور دین سے قربت کا احساس ہوا۔ مجھے اسلام کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ میں نے دمشق میں قیام کے دوران اسلامی کتب اور قُرآن کے ترجمے کا مطالعہ کیا۔

دمشق شام میں اموی جامعہ مسجد

ابتداء میں قُرآن کے احکام سے میں کچھ گھبرایا، مگر جلد ہی مُجھے احساس ہونے لگا کہ احکامِ خداوندی تو عین فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قُرآن میں فرمایا:

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿النجم۔ 39﴾ اور انسان کو وہی ملتا ہے، جس کیلئے وہ محنت کرتا ہے۔

قُرآنی تعلیمات سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ انسان محنت کا اللہ سے صِلہ پاتا ہے اور گناہ انسانی فطرت کی لغزش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قُرآن میں اللہ نے اپنے اور اپنی تمام مخلوق کے مقام کو تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔ یہ بھی بتا دیا ہے کہ کائنات کا رب صرف میں ہی ہوں، میرے جیسا کوئی بھی نہیں۔ میرا متبادل بننے کے دعویداروں اور بنانے والوں پیروکاروں کو مرنے کے بعد سخت عذاب دونگا۔ میں گنہگاروں کو جہنم میں پھینک دوں گا جو ایک آگ کا سمندر ہے، جس میں وہ ہمیشہ عذاب جھیلتے رہیں گے۔ جو نیک لوگ ہونگے میں انکو جنت کے باغات اور طرح طرح کی نعمتیں عطا کروں گا، جن سے وہ نہ ختم ہونیوالی زندگی میں مستفید ہوتے رہیں گے۔ اسلامی تعلیمات اور قُرآن کو پڑھ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ عرب معاشرے میں لوگ کیوں اتنے مطمئن ہیں اور وہ ایک نظم و ضبط کیساتھ ایک ایسی زندگی گذار رہے ہیں، جِس کا معاوضہ وہ مرنے کے بعد اپنے رب سے حاصل کریں گے۔

خطۂ عرب میں اسلامی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد میں واپس یورپ روانہ ہوا۔ یہ 1923ء میں خزاں کا موسم تھا، میرا پہلا پڑاؤ ترکی میں ہوا، یہاں میں چند ماہ مقیم رہا۔ ترکی کے لوگ مجھے عربوں کے برعکس اکھڑ اور خشک مزاج لگے۔ میں استنبول سے صوفیا اور بلگراڈ کے راستے ٹرین کا سفر کرتے ہوئے اٹلی کے پہلو سے نکل کر ویانا جا رہا تھا۔ سفر کے دوران مجھے مطلق احساس نہیں ہوا کہ میں ایک بالکل مختلف معاشرت و تمدن میں داخل ہو رہا ہوں۔

یورپ پہنچ کر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں ایک سیاح ہوں اور وہاں کے مناظر دیکھ کر ایک اذیت سی محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگ رہے تھا کہ جیسے لوگ کسی مقصد کے بغیر خود نمائی کی دُنیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری طرح بہت سے یورپین لوگوں نے خطۂ عرب کی سیاحت کی ہو گی، کیا وہ بھی اسلامی معاشرت سے متاثر ہو کر میری طرح سوچتے ہونگے؟ اِس کا جواب برسوں بعد مجھے اُس وقت ملا جب جدہ سعودی عرب میں ہالینڈ کے سفیر ڈاکٹر وینڈر سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ ایک منجھی ہوئی شخصیت کے مالک تھے، عیسائی ہونے کے سبب اُن کے افکار مسلمانوں کے مخالف تھے۔ مگر اُنہوں نے

اعتراف کیا کہ اُنہیں بشمول ہالینڈ دُنیا میں سب سے زیادہ محبت خطۂ عرب سے ہے۔ جدہ میں اُنکی تعیناتی ختم ہوئی تو وہ مجھ سے ملے انہوں نے کہا:

لیوپولڈ!" کوئی بھی حساس الشعور شخص خطۂ عرب میں قیام کر کے اُن کے طرزِ معاشرت اور زندگی کے سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا"

ویانا پہنچ کر میں نے کچھ وقت اپنے والد صاحب کیساتھ گذارا۔ میرے یونیورسٹی کو خیر باد کہنے اور اچانک اُنہیں چھوڑ جانے کے سبب وہ شدید ناراض تھے، مگر اب اُن کی خُفگی اور ناراضگی کسی حد تک مدھم پڑ چکی تھی۔ میں نے اُنہیں بتایا میں اب مشہورِ زمانہ اخبار "فرینکفرٹر ذئٹنگ" کا مراسلہ نگار ہوں اور آگے بڑھنے کا سفر جاری ہے۔ کچھ ہفتے والد صاحب کی رفاقت میں گُذار کر میں فرینکفرٹ چلا گیا۔

فرینکفرٹر ذئٹنگ اسی ابھی تک میرے مراسم خط و کتابت کے ذریعے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے اُن کو اور اُنہیں مجھے دیکھ لینا چاہیے۔ پتہ تلاش کرتا ہوا میں ایک قدیم محل نما عمارت تک پہنچ گیا۔ اندر داخل ہو کر سیدھا استقبالیہ تک پہنچا اور ادارے کے سربراہ ڈاکٹر سائمن سے ملاقات کی خواہش بیان کرتے ہوئے اپنا کارڈ اُنہیں بھجوایا۔ جلد ہی مجھے ان کے دفتر میں جانے کیلیئے کہا گیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر سائمن مجھے دیکھ کر اتنے حیرت زدہ ہوئے کہ آداب بھی بھول گئے۔ جلد ہی اُنہیں اس بات کا حساس ہوا تو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مصافحہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کیلیئے کہا۔

میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر سائمن کچھ بولنے کی بجائے مسلسل مجھے گھورے جا رہے تھے۔ کمرے میں سکوت سے مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تو میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب! کیا کچھ غلط ہو گیا ہے؟

وہ ایک دم چونکے اور نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ پھر ہنستے ہوئے کہنے لگے: لیوپولڈ! میں سمجھ رہا تھا کہ عمر رسیدہ آدمی سنہری فریم کی عینک لگائے ہوئے میرے سامنے ہو گا، مگر آپ تو میری توقعات کے بالکل بر خلاف نکلے۔ میں اپنے سامنے ایک نوجوان کو دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ معاف کیجئے گا، آپ کی عُمر کیا ہے؟

میں زندگی کی تیئیس بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ کیا میں فرینکفرٹر ذئٹنگ میں کام کرنے کیلیئے معیار پر پورا نہیں اترتا؟

کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر سائمن بولے: لیوپولڈ! آپ کے مقالات کے اعتبار سے میں اپنے اخبار کو کمتر محسوس کر رہا ہوں۔

تمہاری تحریروں کی پختگی سے میں اندازہ کر رہا تھا کہ تم ایک بڑی عُمر کے شخص ہو گے۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر سائمن کو یقین ہو گیا کہ میں مستقبل میں اُن کیلئے ایک بہترین اثاثہ ثابت ہوں گا۔ اُنہوں نے بہتر تنخواہ اور مراعات کیساتھ مجھے واپس مشرقِ وسطیٰ بھیجنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اخبار کے بورڈ نے فیصلہ کیا کہ میں فرینکفرٹ میں قیام کے دوران چیف ایڈیٹر سے رابطے میں رہوں تاکہ ادارے کے معاملات اور کاموں سے واقفیت حاصل کر سکوں۔ گذرتے وقت کیساتھ جرمن حکومت نے افراطِ زر اور معاشی بدحالی پر قابو پالیا تھا اور ہمارا ادارہ بھی اس قابل ہو گیا تھا کہ غیر ملکی نامہ نگاروں کی تنخواہیں اور سفری اخراجات برداشت کر سکے۔

1924ء میں موسمِ بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ ادارے کیجانب سے مجھے مشرقِ وسطیٰ جانے کا پروانہ مل گیا۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنی کتاب ادارے کے حوالے کر دی تھی جو میرے جانے کے چند ماہ بعد شائع ہوئی۔ اگرچہ یہ عرب معاشرے کی موافقت اور صہونیت مخالف رُجحان کی بنا پر اِسے زیادہ پذیرائی نہ مل سکی مگر جرمن صحافت میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

بحری سفر کے ذریعے میری پہلی منزل پورٹ سعید تھی، جہاں سے بذریعہ ریل میں قاہرہ کی جانب روانہ ہوا۔ دورانِ سفر نہر سویز اور بحیرہ المنزلہ میں تیرتی ہوئی بطخیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں، کھیتوں میں ہل چلاتے کسان، چراہگاہوں میں پھرتے جانور اور سروں پر پانی کے گھڑے اُٹھائے جاتی ہوئی عورتیں یہ ایسے مناظر تھے، جن کا حُسن یورپ کی جدید آسائشوں کو ماند کرتا تھا۔ ٹرین میں میرا ایک ہمسفر اسکندریہ کا یونانی تاجر تھا۔ اُس سے خوب گپ شپ رہی۔ اور دوسرا مصری مسلمان تھا جو لباس سے ایک مالدار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ خاموش طبع لگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی ہمارا شریکِ گفتگو بن گیا، اُس نے اعتراف کیا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا مگر اندازِ گفتگو سے لگتا تھا کہ وہ ایک ذوقِ سلیم رکھنے والا ذہین آدمی تھا۔

ہماری گفتگو کا رُخ اسلام کی جانب مُڑا تو یونانی تاجر کہنے لگا۔ اسلام کا نظام اتنا بھی عادلانہ نہیں ہے جتنا کہ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ مصری مسلمان کو شریکِ گفتگو کرنے کیلئے ہم لوگ عربی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ یونانی تاجر بولا: اگر اسلام ایک عادلانہ اور منصفانہ مذہب ہے تو کیا وجہ ہے کہ اسلام مسلمان مرد کو تو یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کی اجازت دیتا ہے، مگر مسلمان عورت کسی عیسائی یا یہودی مرد سے شادی نہیں کر سکتی؟

مصری شخص نے سوال سُنتے ہی کہا: میں آپ کو شریعتِ اسلامی کے اِس قانون کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہم مسلمان سب انبیائے کرام کو مانتے ہیں کیونکہ ہمارے عقیدے کی تکمیل اِس کے بغیر ناممکن ہے۔ جبکہ یہودی اور عیسائی رسُول اللہ محمد ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے۔ اب اگر کوئی یہودی یا عیسائی لڑکی مسلمان مرد سے شادی کرتی ہے تو اُسے یہ اطمینان ہو گا کہ مسلمان اُنکے نبیوں کے بارے میں کوئی نازیبا کلمات نہیں کہیں گے جبکہ ایک مسلمان لڑکی اگر کسی یہودی یا عیسائی مرد سے شادی کرے گی تو اُسے یہ بات ہر وقت پریشان کریگی کہ کہیں کوئی رسُول اللہ محمد ﷺ کے بارے میں نازیبا زبان استعمال نہ کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُسے ایسے کلمات اپنی اولاد سے سننے پڑیں۔ اِس لئے اسلام نے مسلمان عورت کو اہلِ کتاب سے شادی کرنے سے منع کیا ہے۔ یونانی تاجر تو لاجواب ہو کر محض شانے جھٹک کر رہ گیا مگر ایک ان پڑھ دیہاتی مسلمان کے مدلل جواب نے میرے لئے اسلام کا ایک نیا دریچہ کھول دیا۔

میں قاہرہ پہنچا تو میرے حالات گذشتہ کی طرح نہیں تھے، جب میں محض روٹی زیتون اور دودھ پر گذارہ کرتا تھا۔ مگر میں ماضی سے جُڑی یادوں کے سبب اپنی پرانی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ بوڑھی عورت نے بازو پھیلاتے ہوئے مُجھے آغوش میں لیکر ایک شفیق ماں کی طرح رُخسار پر بوسہ لیتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ مُجھے آئے ہوئے تیسرا روز تھا کہ غروبِ آفتاب کے وقت قلعہ کی جانب توپ کا گولہ داغنے کی آواز سنائی دی ساتھ ہی مسجد کے بلند مینار روشنی میں نہا گئے۔ پھر ہر جانب مساجد بُقعۂ نور بن گئیں۔ سڑکوں اور بازاروں میں لوگ خوشیوں کا اظہار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ رمضان کے مقدس مہینے کا آغاز ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مہینہ مسلمانوں کیلئے اللہ اور دینِ اسلام سے اظہارِ عقیدت کا مہینہ ہے۔ بازاروں میں ہوٹل تمام دن بند ہو جاتے ہیں، لوگ کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں۔ پھر دن ڈھلتے ہی ہوٹلوں کی رونقیں بحال ہو جاتی ہیں اور اذانِ مغرب ہوتے ہی خوشی کا سماں ہوتا ہے۔ کھانے پینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دینِ اسلام جیسا نظم وضبط کسی اور مذہب میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

قاہرہ میں مجھے اپنے مسلمان دوستوں سے دوبارہ ملنے کا موقع ملا۔ اِن میں شیخ مُصطفیٰ المراغی بھی تھے۔ یہ جامعہ الازہر سے فارغ التحصیل تھے۔ اِن کی صُحبت میں بیٹھ کر مجھے اسلام کو جاننے کا موقع ملا اور وقت تیزی سے میرے اور اسلام کے درمیان حائل فاصلوں کو کم کر رہا تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے۔ میں نے

اُن سے سوال کیا: کیا یہ ضروری ہے کہ آدمی ایک مخصوص طرزِ زندگی اور تعلیمات کو اپنا لے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اخلاقیات کو اپنے وجدان اور ضمیر کے فیصلوں پر چھوڑ دے؟ شیخ صاحب بولے: دین انسانیت کیلئے حدود و قیود کا تعین کرتا ہے جبکہ وجدان اور ضمیر کی آواز کو سمجھنا صرف انبیائے کرام علیہم والسلام کا خاصا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں رہ کر مجھے اسلام کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا اور نتیجتاً میں اسلام کی جانب کھچتا چلا گیا۔

1925ء میں مجھے جنوبی ایشیا میں جانے کا موقع ملا۔ میں نے کئی مہینے افغانستان میں گذارے۔ سالِ رواں کے آخری مہینوں کی بات ہے کہ میں ہرات سے کابل جا رہا تھا۔ سفر میں میرے ساتھ ایک ملازم اور ایک افغان فوجی تھے۔ موسمِ سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہم پہاڑوں کے درمیان سے گذر رہے تھے جن کی چوٹیاں سفید برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں کچھ اُفسردہ سا تھا کیونکہ میں اب اُن لوگوں سے جدا ہو رہا تھا، جن کی رفاقت میں وقت بہت اچھا گذرا اور انہوں نے مجھے دینِ اسلام کے دروازے کے عین سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

دورانِ سفر میرا گھوڑا لنگڑانے لگا تو میرے افغانی رفیق نے دیکھ کر بتایا کہ اس کے ایک پاؤں کی نعل اُکھڑ گئی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے یہاں سے تین میل کے فاصلے پر گاؤں "زنگی" ہے۔ وہاں پڑاؤ ڈال کر گھوڑے کی نعل درست کروالیں گے۔ گاؤں کا سردار اجنبی مہمان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ سردار افغانستان کے حاکم شاہ امان اللہ کا قریبی رشتہ دار تھا۔ گاؤں کے سردار سے خوب کھل کر مذہب اور سیاست کے بارے میں بات ہوئی۔ اُس نے گاؤں کے ایک شخص سے ستار پر ہمیں پشتو گیت سنوائے اور نہایت اچھے افغانی کھانوں سے ہماری تواضع کی۔ رُخصت ہوتے وقت اُس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا: آپ مسلمان ہیں۔

میں نے فوراً جواب دیا: میں مسلمان نہیں ہوں، مگر میں نے زندگی کا ایک حصہ مشرقِ وسطیٰ میں گذارا ہے اور میں نے اسلامی معاشرے اور تمدن کو قریب سے دیکھا اور پڑھا ہے اِس لئے میں اسلام کے موضوع پر کھل کر بحث کر لیتا ہوں۔ میں جب مسلمانوں کو دین کی ناقدری کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو غُصہ آجاتا ہے۔ میری کوئی بات تلخ لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

میرا میزبان بولا: میں پھر کہتا ہوں کہ آپ مسلمان ہیں مگر آپ کو اِس کی خبر نہیں۔ آپ کا دینی علم ہم سے زیادہ ہے اور آپ کے وجود سے مسلمان بول رہا ہے، تو آپ کیوں نہیں ابھی اور اسی وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے؟ میں کل آپ کیساتھ

کابل چلوں گا اور آپ کو شاہ امان اللہ سے ملواؤں گا۔ بھائی امان اللہ بڑی گرمجوشی سے آپ کا استقبال کریں گے اور آپ کو مکان، باغات مویشی اور بیش قیمت تحائف دیں گے ہم سب آپ سے بے پناہ محبت کریں گے۔ میرے بھائی آپ کلمہ پڑھ لیجئے!

میں نے کہا: میرے دوست! میں مسلمان اپنے ضمیر کی آواز پر ہونا چاہتا ہوں، مجھے مکان و جائیداد یا تحائف کا لالچ نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا: آپ ہم سے زیادہ اسلام کو جانتے ہیں، کونسی ایسی بات ہے جو ابتک آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟ میرے دوست! بات سمجھ کی نہیں بلکہ روحانی اطمینان کی ہے۔ جس دن یہ ہو گیا میں ایک لمحہ بھی دیر نہیں کرونگا۔ کابل میں قیام کر کے میں جنوبی افغانستان سے گذرتا ہوا قدیم شہر غزنی سے گذرا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں سے سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ پھر میں جنوب مغربی افغان صحراء سے ہوتا ہوا واپس ہرات پہنچ گیا۔ 1926ء کے اختتام پر ہرات سے میں نے ایک طویل سفر اختیار کیا اور روسی ترکستان، سمرقند، بخارا، تاشقند اور ترکمانستان کے وسیع و عریض میدانوں سے ہوتے ہوئے ماسکو پہنچا۔ ماسکو سے میں پولینڈ کی سرحد عبور کر کے سفر کو سمیٹتے ہوئے فرینکفرٹ پہنچ گیا۔ اپنے اخبار کے دفتر پہنچا تو پتہ چلا کہ میرے مضامین اور نامہ نگاری نے مجھے ایک مشہور شخص بنا دیا تھا۔ اب میرا شمار یورپی اخبارات کے ممتاز نامہ نگاروں میں ہونے لگا تھا۔

1926ء میں میری ایلسا سے شادی ہو گئی۔ اسی سال سفر و سیاحت اور کتاب لکھنے جیسے مسائل پر ڈاکٹر سائمن سے میرے اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ چنانچہ میں نے فرینکفرٹر ذئٹنگ کو چھوڑ دیا اور اپنی بیوی کیساتھ برلن چلا گیا۔ برلن میں دیکھ کر میرے پرانے دوست بہت خوش ہوئے۔ ایک روز میں اپنی بیوی کیساتھ برلن میں زمین دوز ٹرین سے سفر کر رہا تھا کہ۔ میری نظر سامنے بیٹھے ہوئے شخص پر پڑی، وہ کوئی دولتمند اور خوشحال تاجر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بے چین اور غمزدہ سا لگ رہا تھا۔ اُس کے پہلو میں ایک مہذب خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی کرب اور بے چینی عیاں تھی۔ میں نے اِس بات کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ وہ اُنہیں دیکھ کر کہنے لگی: آپ درست کہتے ہیں مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے، کہ جیسے وہ خوشحال زندگی کے باوجود جہنم کی سی زندگی گذار رہے ہیں۔

ہم گھر واپس پہنچے تو میں نے معمول کے مطابق قُرآن کھولا تو سُورہ التکاثر سامنے آگئی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا:

"لوگو! تم کو زیادہ مال سمیٹنے کی خواہش نے غفلت میں ڈالے رکھا۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائیگا۔ پھر دیکھو! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائیگا۔ دیکھو اگر تم حقیقی علم رکھتے تو غفلت میں نہ پڑتے۔ تمہیں ضرور دوزخ کو دیکھنا ہے۔ پھر تم اِس کو یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے۔ پھر اُس روز تم سے شکرانۂ نعمت کے بارے میں ضرور پوچھا جائیگا۔"

ایک لمحے کیلئے میں گم سا ہو گیا، میرے ہاتھ قُرآن تھامے ہوئے لرز رہے تھے۔ میں نے اپنی بیوی کو پکارا: ایلسا سنو تو! کیا یہ رات والے واقعہ کا جواب نہیں ہے جو ہم نے ریل میں دیکھا تھا؟ یہ کہتے ہوئے میں نے پوری سُورہ کا ترجمہ اُسے سُنا دیا۔

ہاں لیوپولڈ! اس نے تو بالکل واقعہ کی عکاسی کی ہے۔ میں قُرآن ہاتھ میں تھامے سوچ رہا تھا۔ یہ کتاب آج سے تیرہ سو سال قبل نازل ہوئی تھی۔ اُس وقت تو مشینی دور نہیں تھا، مگر یہ سُورہ تو آج کے دور کی پیشگوئی کر رہی ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ قُرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں ہے۔ انسان لاکھ دانا اور سمجھدار سہی، مگر جزیرۂ عرب کے صحراؤں اور پہاڑوں میں آج سے تیرہ سو سال پہلے رہنے والا انسان ایسے عذاب کی پیشگوئی نہیں کر سکتا تھا۔ آج مجھے قُرآن کے اندر سے محمد ﷺ کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں منزل تک پہنچ گیا تھا۔

میں اپنے ایک ہندوستانی دوست عبدالجبار خیری کے پاس گیا۔ وہ برلن میں مسلمانوں کی انجمن کے صدر تھے۔ میں نے بغیر تمہید کے اپنا مقصد بیان کیا: دوست! میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے بھی اپنا داہنا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا۔ دو گواہوں کی موجودگی میں اُنہوں نے مجھے کلمۂ شہادت پڑھایا:

''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ''

میرے کلمہ ادا کرتے ہی اُنہوں نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا: آپ کا نام لیوپولڈ ہے، یونانی زبان میں "لیو" شیر کو کہتے ہیں، اس لئے ہم آج سے آپ کو "محمد اسد" یعنی محمد ﷺ کا شیر کہیں گے۔ چند ہفتے بعد میری بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اُس کا نام منیرہ اسد رکھا۔ میں نے اسلام قبول کرنے کی اطلاع اپنے والد کو دی مگر اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ خط لکھتے ہوئے اُنہیں بتایا کہ اسلام مجھے والد کی بہت زیادہ محبت اور عزت کا درس دیتا ہے، لیکن اُنہوں نے اِس خط کا بھی جواب نہیں دیا۔

جنوری 1927ء میں ایک مرتبہ پھر میں نے مشرقِ بعید کی جانب بحری سفر اختیار کیا، میرا یہ سفر اللہ کی رضا کیلئے تھا اور میں فریضۂ حج کیلئے سرزمینِ حجاز جارہا تھا۔ اب حالات بھی پہلے سے یکسر مختلف تھے۔ ایک تو میں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ میرے ساتھ اسلام قبول کرنے والی میری بیوی ایلسا اور میرا چھوٹا سا بیٹا احمد بھی شریکِ سفر تھے۔ جہاز اپنے شیڈول کے مطابق بندرگاہوں پر رکتا ہوا منزل کیجانب رواں دواں تھا۔ جہاز میں میرے ساتھ ایک چھوٹے قد کا جرمن مسلمان بھی سوار تھا۔ اُن کا نام محمد صالح تھا۔ جب اُنہیں پتہ چلا کہ میں نو مسلم ہوں تو اُنہوں نے میرے ساتھ بڑا مشفقانہ رویہ رکھا۔ بحری سفر چونکہ طویل دورانیے کا ہوتا ہے اس لئے ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ محمد صالح مجھے اپنے گاؤں اور پہاڑوں کے دلچسپ قصے سناتے رہتے تھے۔

ایک شام جب میں عرشے پر اُن سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ اُن کا ایک یمنی دوست بیمار ہے مگر ڈاکٹر کمتر درجے کا مسافر ہونے کی وجہ سے اُسے دیکھنے کیلئے تیار نہ تھا۔ میں نے مریض کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اُسے ملیریا بخار تھا۔ میں نے اُسے کونین کی چند گولیاں دیں، جنہیں کھا کر وہ صحتیاب ہو گیا۔ اُس کے دوست محمد صالح کیساتھ میرے پاس آئے اور ایک تھیلی پیش کی جس میں کچھ فرانک تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ زیادہ رقم تو نہیں دے سکتے مگر آپ یہ رقم قبول کر لیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں نے یہ دوائی پیسوں کیلئے نہیں دی، مگر وہ بضد تھے کہ میں یہ رقم قبول کر لوں، ہم آپ سے بہت خوش ہیں اور آپ ہم سے بہت بہتر اور افضل ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ غریب لوگ ہیں اور بڑی مشکل سے اتنے پیسے اکٹھے کئے ہیں۔ میرے انکار سے اُنہیں مایوسی ہو رہی تھی، اُنہوں نے رسُول اللہ ﷺ کا واسطہ دیکر کہا کہ میں یہ رقم قبول کر لوں اور چاہوں تو پورٹ سعید کے غربا میں تقسیم کر دوں۔ مجبوراً مجھے وہ رقم قبول کرنا پڑی، اور میرے اِس عمل سے اُن کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے۔

جیسے جیسے منزل قریب آرہی تھی جہاز سے "لبیک، اللھم لبیک" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ جہاز کے کمروں کے علاوہ عرشہ اور راہداریاں بھی اللہ کی رضا کیلئے حج پر جانیوالوں سے بھری پڑی تھیں۔ مقامِ میقات کا اعلان ہوتے ہی لوگوں نے سفید احرام باندھ لئے تھے۔ پھر ایک صُبح جہاز جدہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا۔ سب لوگ جہاز کے عرشے پر آکر سرزمینِ عرب کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور فضا اللہ اکبر اور لبیک، اللھم لبیک کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ میں بھی ایک عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے روز شام حجاج کا قافلہ اونٹوں اور گدھوں بیٹھ کر مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہوا۔ رات راستے میں پڑاؤ ہوا اور وہیں ایک بیمار شخص کا انتقال ہو گیا۔ اسی جگہ نماز جنازہ ادا کر کے مرحوم کی تدفین کر دی گئی۔ اگلے روز طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی مکہ شہر کے مکانات دکھائی دینے لگے، سورج نکلا تو ہم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے ہماری مدد معلم حسن عابد نے کی۔ کعبہ نظر آیا تو میرا ایمان تازہ ہو گیا، میرے سامنے کعبہ (بیت اللہ) کی عمارت یعنی اللہ کا گھر تھا۔ وہ مقام جس کا دیدار اور طواف لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ کر چکے تھے اور کتنے ہی لوگ دورانِ سفر یا منزل پر پہنچ کر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ یہ سوچ کر ربِ کائنات کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے عرب ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے حسین سے حسین تر مساجد دیکھیں مگر میری کیفیت ایسی کبھی نہ ہوئی تھی جیسی کہ آج ہو رہی تھی۔ ویسے تو اللہ ہر وقت مومن کے نزدیک ہوتا ہے مگر یہاں پر تو اُس کی خصوصی توجہ ہوتی ہے۔ حج کے موقع پر کتنے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں جنکی آہوں اور سسکیوں بھری دُعاؤں پر اللہ اُنہیں معاف فرما دیتا ہے اور اُن کی زندگیاں گناہوں کے داغوں سے دُھل کر صاف ہو جاتی ہیں۔

مکہ معظمہ میں قیام کے نو دن بعد میری بیوی "ایلسا" کا مختصر سی علالت کے بعد انتقال ہو گیا اور اُسے وہیں قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ حج کے فرائض ادا کر کے میں اپنے بیٹے احمد کیساتھ مدینہ روانہ ہو گیا۔ ادائیگیِ حج اور مدینہ میں قیام کے دوران اپنے جذبات و احساسات اگر بیان کرنے لگوں تو شائد بہت وقت اور بہت سی کتابیں درکار ہونگی۔ مختصراً یہ کہ میری سیاحت نے مجھے آج ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ جس پر خوش نصیب ہی پہنچ پاتے ہیں اور اللہ کریم نے مجھے بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل کر لیا۔ میرا بیٹا احمد ایک سال تک میرے ساتھ سعودی عرب میں رہا۔ پھر ایلسا کے والدین نے اصرار کر کے اُسے اپنے پاس بلا لیا اور وعدہ کیا کہ وہ بچے کو یورپ کے کسی مدرسہ سے دینی تعلیم دلوائیں گے۔ اُس وقت احمد کی عُمر دس سال تھی۔

علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ نے چھ سال مکہ و مدینہ میں قیام کیا۔ اِس مُدت میں اُنہوں نے قُرآن و حدیث، عربی اور اسلامی تاریخ میں تعلیم حاصل کی۔ اپنے قیام کے دوران وہ سعودی فرمانروا عبدالعزیز السعود سے بھی ملے اور ولی عہد شاہ فیصل بن سعود سے بھی ملاقات کی۔

علامہ محمد اسد مفکر، دانشور، محقق، تاریخ دان، صحافی، سیاح اور عالم تھے۔ ایک طویل تحقیق کے بعد اُنہوں نے اسلام قبول کیا اور پھر اپنی زندگی اسلام کیلئے وقف کر دی۔ دی روڈ ٹو مکہ اور دی میسج آف قُرآن اُن کی مشہور تصنیفات ہیں۔ دی روڈ ٹو مکہ اُن

کی سوانحِ حیات ہے۔ انڈیا میں "البعث الاسلامی" کے مدیر جناب محمد الحسنی صاحب نے اِس کتاب کا اردو ترجمہ "طوفاں سے ساحل تک" کے عنوان سے کیا۔ جو لکھنؤ انڈیا سے 1961ء میں شائع ہوا۔

علامہ محمد اسد نے قُرآن اور حدیث کا بغور مطالعہ کیا۔ برِ صغیر میں اُن کے آنے وجہ غزوۂ ہند کی حدیثِ مبارکہ تھی۔ چنانچہ 1932ء میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ آپ کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوئے اور اُنہوں نے آپ کو بتایا کہ یہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آنیوالی ہے اور حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے آپ سے یہیں قیام کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ قیامِ پاکستان تک علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ یہیں مقیم رہے اور انہوں نے جدوجہدِ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے توسط سے علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات چوہدری نیاز علی سے ہوئی۔ اُنہوں نے مل کر پٹھانکوٹ میں ادارہ دارالسلام بنایا اور علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ نے یہیں سکونت اختیار کرلی۔ علامہ محمد اسدؒ نے کافی وقت حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ اور چوہدری نیاز علی کی صحبت میں گذارا اور اُنہیں اسلام کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ 1939ء میں جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی تو علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کو انگریزوں نے اِس بنا پر گرفتار کرلیا کہ اُن کا تعلق جرمنی اور آسٹریا سے تھا اور وہ یہودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آسٹریا میں اُن کے خاندان والوں کو قتل کر دیا۔ دورانِ اسیری چوہدری نیاز علی نے اُن بیوی منیرہ اسد اور بیٹے طلال اسد کا خیال رکھا۔ 1945ء میں جب جنگ ختم ہوئی تو آپ کو رہائی نصیب ہوئی۔

علامہ محمد اسدؒ کے قائدِ اعظم محمد علی جناح سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو آپ کی علمی قابلیت کا ادراک تھا۔ جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو قائدِ اعظم محمد علی جناح کی گورنمنٹ نے تین ادارے تشکیل دیئے۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان، انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) اور ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ریکنسٹریکشن۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کو ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ریکنسٹریکشن کا ڈائریکٹر بنایا اور اُن کے ادارے کو چار نقاطی ایجنڈہ سونپا گیا:

اسلامی آئین تشکیل دینا، اسلامی معاشی نظام تشکیل دینا، اسلامی تعلیمی نظام تشکیل دینا اور زکوۃ و عُشر کی بنیاد پر اسلامی سوشل ویلفیئر نظام تشکیل دینا۔

علامہ محمد اسد نے ادارے کی تشکیل کے بعد "عرفات" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جس میں اُنہوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی ریڈیو سے نشر ہونیوالی تقریر "ہم نے پاکستان کیوں بنایا" بھی لکھی۔ قائدِ اعظم کہا کرتے تھے کہ میری جیب میں

کھوٹے سکے بھی ہیں، جن میں ایک کھوٹہ سکہ سر ظفر اللہ تھا جو قادیانی تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کا 1948ء میں انتقال ہوا تو اُس وقت سر ظفر اللہ وزیرِ خارجہ تھا۔ اِس شخص نے اسلامی آئین کی تشکیل کو روکنے کیلئے علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کو اقوامِ متحدہ میں سفیر مقرر کر دیا۔ علامہ محمد اسدؒ جب اقوامِ متحدہ چلے گئے تو سر ظفر اللہ نے پُر اسرار طریقے سے آگ لگوا کر ادارے کا سارا ریکارڈ ضائع کر دیا۔ یہ قادیانیوں کی پاکستان کے خلاف پہلی سازش تھی، جِس سے پاکستان اسلام کے ٹریک سے اُتر کر جمہوریت جیسے کافرانہ نظام کی بھینٹ چڑھ گیا اور دوبارہ آج تک اسلام کے ٹریک پر نہ چڑھ سکا۔

Asad (front center) with staff of the Department of Islamic Reconstruction, West Punjab (Pakistan), 1948-49.

اقوامِ متحدہ جانے کیلئے علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کو پاسپورٹ کی ضرورت پڑی۔ اُنہوں نے پاسپورٹ کیلئے اپلائی کیا تو اُس وقت فارم پر ایک خانے میں شہریت یا شہری کے خانے میں "برطانیہ" لکھا جاتا تھا۔ آپ نے اصرار کیا کہ میں تو پاکستانی ہوں اِس لئے یہاں پاکستانی شہری لکھا جائے۔ پاسپورٹ آفس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اِس کیلئے وزیر اعظم سے منظوری لینا ہو گی۔ چنانچہ علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت کے وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملے اور سارا واقعہ سناتے ہوئے پاکستانی شہری لکھنے کی درخواست کی۔ وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے شہری کے خانے میں پاکستانی لکھنے کے حکمنامے پر دستخط کر دیئے۔ چنانچہ علامہ محمد اسد کو پہلا پاکستانی ہونے کا شرف حاصل ہے جنہیں پہلا پاکستانی شہری کا پاسپورٹ ملا۔ علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آسٹریا اور پاکستان کی شہریت تھی۔

اقوامِ متحدہ میں سفیر کی خدمات سرانجام دیتے ہوئے علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات ایک پولش نژاد امریکی عورت سے ہوگئی۔ آپ اُس عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر پاکستانی گورنمنٹ سروس رولز کے مطابق وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ اُنہوں نے گورنر جنرل سے شادی کرنے کی اجازت کیلئے درخواست کی مگر مسترد کردی گئی۔ چنانچہ علامہ محمد اسدؒ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی عرب بیوی منیرہ کو طلاق دیکر پولش عورت سے شادی کرلی،۔ یہ اُن کی تیسری شادی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علامہ محمد اسدؒ اپنی پولش بیوی کیساتھ سوئٹزرلینڈ چلے گئے، جہاں اُنہوں نے اپنی کتاب " دی روڈ ٹو مکہ " کو مکمل کیا۔

1957ء میں محمد اسد، پولا حمید اسد جوہر آباد (پاکستان) میں چوہدری نیاز علی کی فیملی کیساتھ

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے دوران علامہ محمد اسدؒ سے پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ صدر جنرل محمد ایوب خان اُن کی کتاب " دی پرنسپل آف اسٹیٹ اینڈ گورنمنٹ ان اسلام " سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وہ علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کو سات رکنی کمیٹی کا رکن بنانا چاہتے تھے، جو آئینِ پاکستان کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کیلئے بنائی گئی تھی۔

علامہ محمد اسدؒ چونکہ اُن دنوں قُرآنی احکام کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہے تھے، اس لئے انہوں نے کمیٹی ممبر بننے سے معذرت کرلی۔

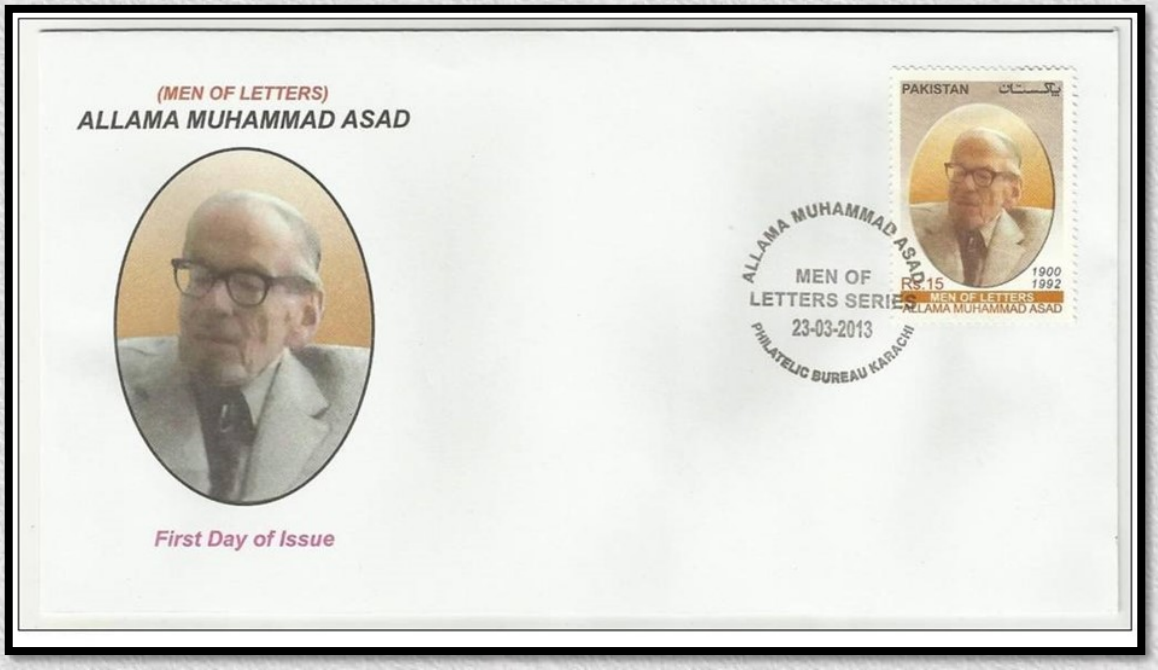

2013ء میں محکمۂ ڈاک پاکستان کی جانب سے جاری کردہ ٹکٹ

اِس واقعہ کے کئی سال بعد 1983ء میں صدر جنرل محمد ضیاالحق نے اُنہیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ علامہ محمد اسدؒ دعوت قبول کرتے ہوئے پاکستان آئے۔ پاکستان میں اُنہیں پہلی بار اسلام آباد دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ عظیم شہری علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کا آخری دورہ تھا۔ پاکستان میں قیام کے دوران اُن کی ملاقات انصاری کمیشن کے ممبران سے بھی ہوئی جو مستقبل کے صدر کا ایجنڈا تیار کر رہا تھا۔ علامہ محمد اسدؒ نے کمیشن کے کچھ نکات سے اتفاق کیا اور باقی نکات سے اختلاف کیا۔ ایک اہم نکتہ الیکشن کے طریقۂ کار میں عورت کو مرد کے برابر حقوق (وزیرِ اعظم بننے کی اہلیت) دینے میں مزاحمت کرنے کا تھا۔ غالباً اِس نقطے کا مقصد عورت کی حکمرانی کے ساتھ بینظیر کو وزیرِ اعظم بننے سے روکنا تھا۔ علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ قیام کے دوران لاہور اور اسلام آباد میں اپنے کئی پرانے دوستوں سے بھی ملے۔ اُنہوں نے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے کئی پروگرامز میں بھی بطور مہمان شرکت کی۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے اُنہیں پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی پیشکش کی گئی اور اُنہیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے سینکڑوں ایکڑ اراضی، رہائش کیلئے گھر اور تحائف کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے معذرت کرلی۔

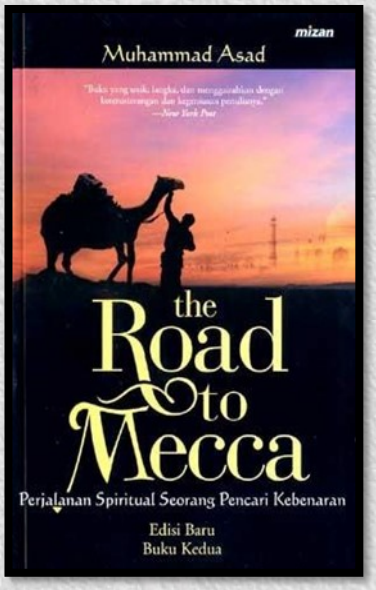

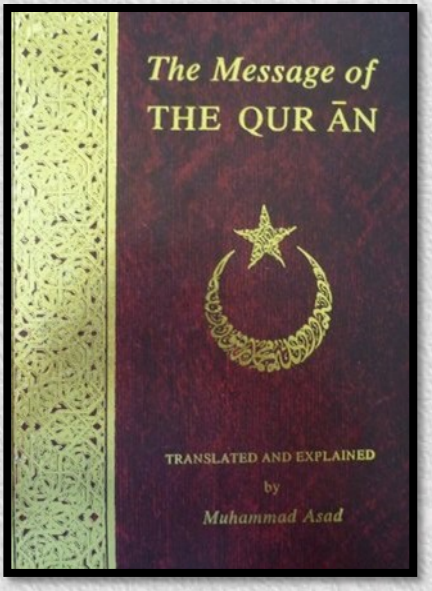

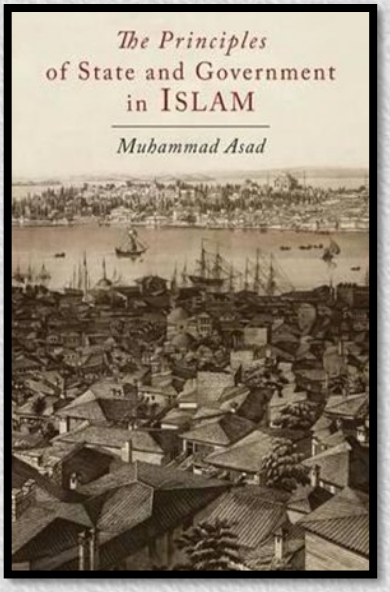

علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق تصانیف

1955ء میں علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ اپنی تیسری بیوی پولا حمیدہ اسد کے ساتھ نیویارک سے اُندلس اسپین چلے گئے اور اُنہوں نے اپنی عُمر کا باقی حصہ وہیں میں گذارا۔ 23 فروری 1992ء کو بیاسی برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُنہیں اندلس کے شہر گرناڈا میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری بیوی منیرہ اسد سے اُن کے دوسرے بیٹے طلال اسد ہیں۔

محمد اسد اسکوائر ویانا، آسٹریا

2008ء علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے آسٹریا میں ویانا کی سٹی گورنمنٹ نے اقوامِ متحدہ کے دفاتر کے سامنے کی جگہ کو "محمد اسد اسکوائر" کا نام دیا۔

علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کی آخری ایام کی تصویر

علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک جرمن نو مسلم ویلفرڈ ہوف مین نے کہا: "محمد اسد اسلام کیلئے یورپ کا تحفہ ہیں"۔

بانیٔ جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: "میرا خیال ہے کہ دورِ جدید میں یورپ سے اسلام قبول کرنیوالوں میں محمد اسد سب سے قیمتی ہیرا ہیں"۔

مارٹن لِنگز

برطانوی نژاد نو مسلم ابو بکر سراج الدین

یہ کہانی لنکاشائر کے علاقے برن ایج کے علاقے میں ایک عیسائی پروٹسٹنٹ گھرانے کی ہے۔1909ء میں اُن کے ہاں ایک بچے کی پیدائش ہوئی، بچے کا نام مارٹن لِنگز رکھا گیا۔ابتدائی تعلیم وہیں پر ہوئی۔ مارٹن لِنگز بچپن سے ہی سفر وسیاحت کے شوقین تھے۔مارٹن لِنگز نے میگڈیلن کالج آکسفورڈ سے انگریزی زبان و ادب میں ڈگری حاصل کی۔ آکسفورڈ میں قیام کے دوران اُنہیں فرانسیسی نو مسلم رینے گینوں کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملا۔ رینے گینوں ماوراءالطبیعات کے ماہر تھے۔ گریجویش مکمل کر کے مارٹن لِنگز لیتھوانیا چلے گئے، جہاں پروائی ٹاٹس میکنس یونیورسٹی میں انگلش ادب (مڈل انگلش اور اینگلو سیکسن) کے مضامین پڑھانے لگے۔

مارٹن لِنگز رینے گینوں کی تحریروں سے کافی متاثر ہوئے اور اُنہیں اسلام کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہوا۔ اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ جان گئے کہ یہی حقیقی دین ہے۔ اُنہوں نے 1938ء میں اسلام قبول کر لیا۔ مارٹن لنگز نے اپنا اسلامی نام ابو بکر سراج الدین رکھا۔ تاریخ میں وہ دونوں ہی ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔

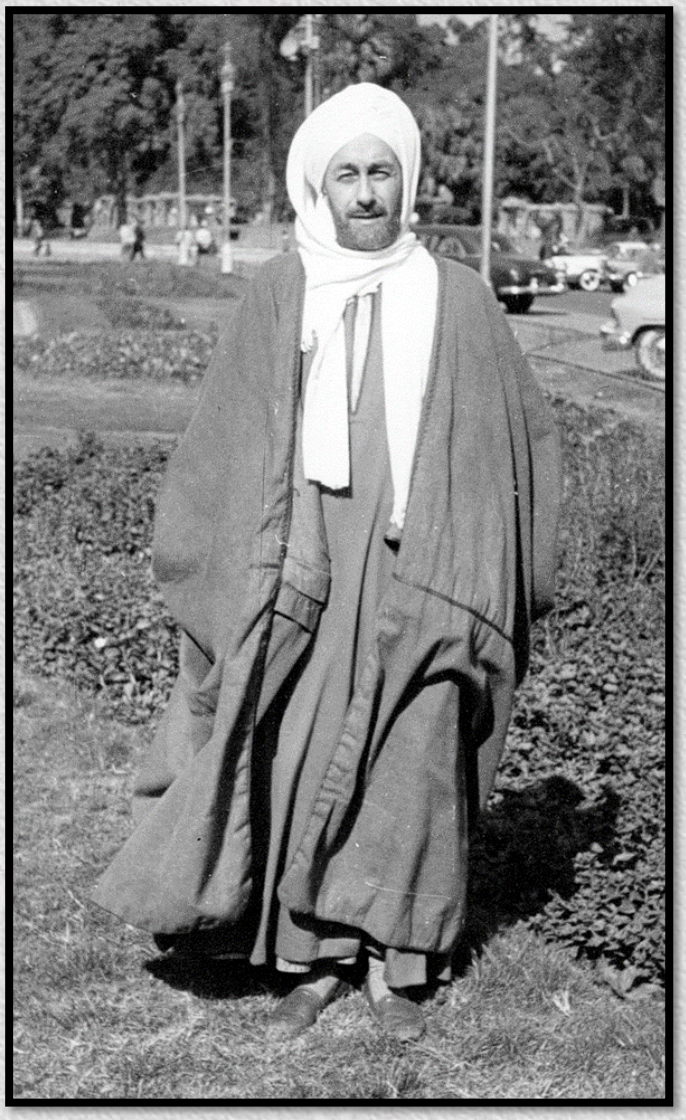

ابو بکر سراج الدین 1939ء میں قاہرہ مصر چلے گئے، جہاں پر اُن کا ایک دوست رینے گینوں کا اسسٹنٹ تھا۔ ابو بکر سراج الدین نے اسی کے پاس قیام کیا۔ کچھ عرصے بعد اُن کے دوست کا انتقال ہو گیا۔ ابو بکر سراج الدین کو اسلام کے متعلق علوُم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا، اِس لئے اُنہوں نے وہیں پر عربی زبان پڑھنا شروع کر دی تھی۔ وہ کافی عرصہ تک قاہرہ میں ہی مقیم رہے۔ سلسلۂ روزگار چلانے کیلئے اُنہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں انگریزی زبان کے اتالیق کی نوکری کر لی۔ وہ شیکسپیئر کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں وہ ہر سال شیکسپیئر کے ڈراموں کا انعقاد کرواتے تھے۔

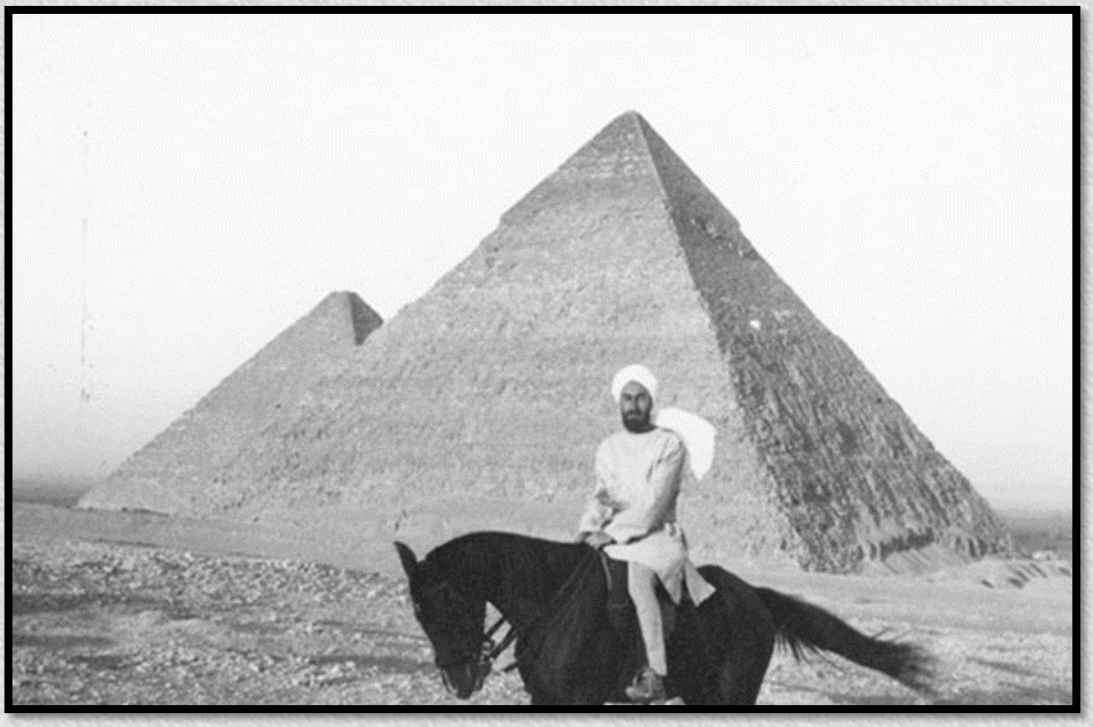

مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین 1940ء میں اہرامِ مصر کے نزدیک گھوڑے پر سوار

1944ء میں ابو بکر سراج الدین نے لیزلی سمالی نامی عورت سے شادی کر لی۔ وہ ایک پُر سکون زندگی گذارنا چاہتے تھے اِس لئے اُنہوں نے اہرامِ مصر کے نواحی گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔ 1952ء میں مصر کے اندر تاجِ برطانیہ کے خلاف ہنگامے پھوٹ پڑے۔ ابو بکر سراج الدین چونکہ برطانوی شہریت کے حامل تھے، اِس لئے اُنہیں مصر چھوڑ کر برطانیہ واپس لوٹنا پڑا۔ برطانیہ واپس لوٹ کر ابو بکر سراج الدین نے دوبارہ پڑھائی شروع کر دی۔ پہلے اُنہوں نے عربی زبان میں بی اے کیا اور پھر یونیورسٹی آف لندن کے سکول آف اورئنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے صوفی ازم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اُنہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ الجزائر کے صوفی احمد العلولی کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ جب یہ مقالہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا تو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ابو بکر سراج الدین کی یہ کتاب ایک درویش صفت شخصیت کی زندگی اور فلسفہ کے بارے میں نہایت عمدہ تصنیف تھی۔

ڈاکٹریٹ کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین نے برٹش میوزیم میں نوکری حاصل کر لی اور کچھ عرصہ بعد وہ برٹش میوزیم چھوڑ کر برٹش لائبریری چلے گئے۔ اور وہ وہاں 1970ء سے 1973ء تک مشرق سے متعلق تحریری مواد

کے نگران رہے۔ ملازمت کے دوران وہ (Studies In Comparative Religion) میں متواتر لکھتے رہے۔

مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین کی ایک خوبصورت تصویر

ڈاکٹر ابو بکر سراج الدین نے اپنی عُمر کے آخری سالوں میں تحریری مواد میں اضافہ کر دیا۔ وہ زندگی میں ہمیشہ سیاحت کرتے رہتے تھے۔ عُمر کا آخری حصّہ اُنہوں نے کینٹ انگلینڈ میں گذارا۔ ڈاکٹر مارٹن لنگز ابو بکر سراج الدین چھیانوے برس کی عُمر میں 11 مئی 2005ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ڈاکٹر مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین نے صوفی ازم کے بارے میں ایمان افروز تحریریں قلمبند کی ہیں۔ اُن کی کتاب "وٹ از صوفی ازم" بہت مقبول ہوئی۔ اُنہوں نے رسُول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی دلوں کو موہ لینے والی کتاب "محمد ﷺ، ابتدائی ذرائع کے مطابق اُن کی زندگی" انگریزی زبان میں لکھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکے ہیں۔ کتاب کا اردو ترجمہ "محمد رسُول اللہ ﷺ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اِس کے علاوہ

اُنہوں نے "صوفی پوئمز، صوفی ازم لو اینڈ وزڈم" اور بہت سی دوسری کتابیں تحریر کہ ہیں۔

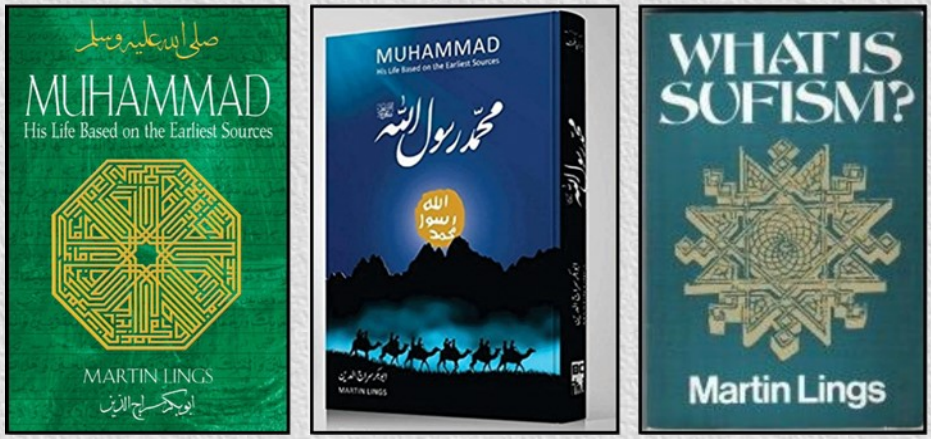

ڈاکٹر مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین نے شیکسپیئر کے بارے میں بھی کتاب لکھی ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن نومبر 1998ء میں شائع ہوا۔ جس کا دیباچہ چارلس پرنس آف ویلز نے تحریر کیا ہے۔

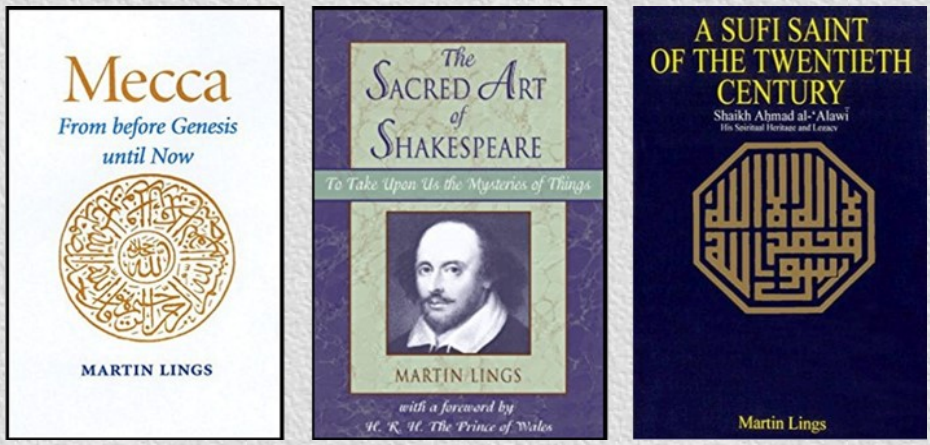

اپنی وفات سے پہلے اُنہوں نے شکیسپیئر کے بار میں ایک انٹرویو دیا تھا جس پر "شیکسپیئر کی روحانیت" کے نام سے ایک فلم بنی، جسے اُن کے نام سے منسوب کیا گیا۔

ڈاکٹر مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ اُن سے پیار کرنیوالے بہت سے لوگ تھے۔ اُن کی وفات پر علم وادب سے تعلق رکھنے والی بہت سی شخصیتوں نے تعزیتی پیغامات بھیجے، جن میں اُن کی عاجزانہ طبیعت اور حق وسچ سے اُن کی گہری وابستگی کا ذکر کیا۔ شیخ حمزہ یوسف نے اُن کے بارے میں نہایت دلکش تحریر لکھی ہے۔

شیخ حمزہ یوسف امریکی نو مسلم ہیں، جنہوں نے سترہ برس کی عمر میں 1977ء میں اسلام قبول کیا۔ وہ کیلیفورنیا امریکہ میں اپنے دینی مدرسے میں اسلام کا عِلم تقسیم کر رہے ہیں۔ مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین سے اُن کی آشنائی کتاب کے ذریعے ہوئی۔ وہ

بتاتے ہیں کہ اُنہیں طلبا کو سیرتِ نبی ﷺ سے روشناس کروانے کیلئے انگریزی میں مستند مواد کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُن کی نگاہِ انتخاب محترم ڈاکٹر مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین کی کتاب "محمد ﷺ، ابتدائی ذرائع کے مطابق اُن کی زندگی" پر جا ٹھہری۔ شیخ حمزہ یوسف کہتے ہیں کہ یہ کتاب نہایت پُر تاثیر تھی اور اِس میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ شاعرانہ تحریر بھی شامل کی ہے۔ دورانِ تدریس طلبا کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے تھے۔ شیخ حمزہ یوسف کہتے ہیں کہ جب میری ملاقات ڈاکٹر صاحب سے ہوئی تو اُنہوں نے عربی زبان میں اپنی کم مائیگی کا ذکر کرتے ہوئے ندامت کا اظہار کیا۔ مگر جب اُنہوں عربی زبان میں گفتگو کی، تو اُن کے خوبصورت انداز سے میں اور میرا ساتھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ڈاکٹر مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین، شیخ حمزہ یوسف اور ساتھی کے ہمراہ

شیخ حمزہ یوسف کہتے ہیں کہ میں ڈاکٹر مارٹن لِنگز سے تسلسل کے ساتھ بہت سی مُلاقاتیں کیں اور میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ مختصراً میں اُن کے بارے میں یہ کہوں گا:

"ڈاکٹر مارٹن لِنگز ابو بکر سراج الدین ایک سچے مُسلمان تھے۔ اُنہوں نے اپنی ذات میں ایک شخصیت کو چھپا رکھا تھا، جِس کی زندگی کا محور فقط ایک اللہ تھا"

میلکم ایکس

سیاہ فام امریکی کا قبولِ اسلام

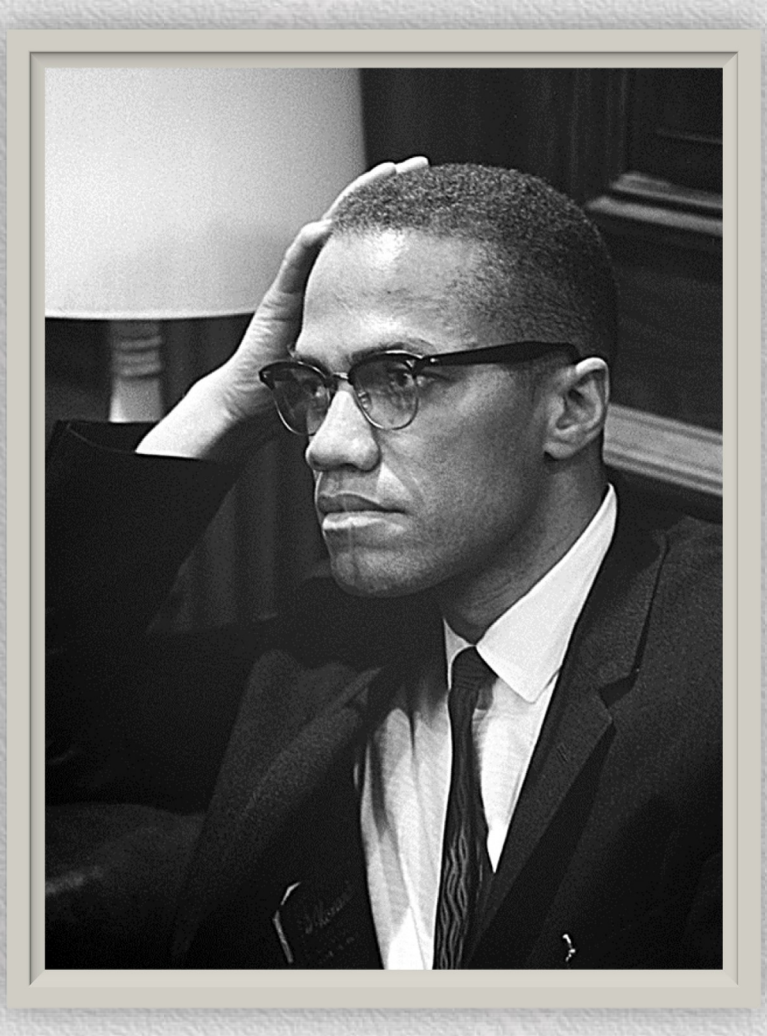

میلکم 19 مئی 1925ء کو امریکی ریاست نیبراسکا کے ایک معمولی سے سیاہ فام گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ آٹھ بہن بھائی تھے اور اُنکا پانچواں نمبر تھا اور اُنہیں میلکم لٹل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔۔ میلکم کا باپ "ارل لٹل" ایک پادری تھا۔ میلکم کی ماں کا نام لوئیس نورٹن لٹل تھا۔ میلکم ابھی چھ برس کا تھا کہ اُس کے باپ کو قتل کر دیا گیا۔ اکیلی ماں کیلئے اتنے بچوں کو پالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اُس نے لوگوں اور رفاعی اداروں سے مدد لیکر گھر چلانے کے کوشش کی مگر حالات اُس کے قابو سے باہر ہو گئے اور بیچاری پاگل ہو گئی۔ بچوں کو مخیر لوگوں میں بانٹ دیا گیا۔ میلکم کو ہر جگہ نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ میلکم نے گریڈ آٹھ تک تعلیم حاصل کی اور حالات کی قید سے بیقرار ہو کر بھاگ نکلا۔

میلکم لٹل کی بھی سیاہ فام لوگوں کی طرح خواہش تھی کہ معاشرے میں گوروں کی طرح عزت ہو۔ زندگی کی گاڑی کو چلانے کیلیئے اُس نے ایک کلب کے باہر بوٹ پالش کرنے کی نوکری کرلی اور کچھ عرصہ ہوٹلوں میں ویٹر کا کام بھی کرتا رہا۔ میلکم اپنی اس زندگی سے زیادہ خوش نہ تھا۔ دوستوں کے مشورے سے اُس نے نیویارک کا رُخ کیا اور ہارلم کے علاقے میں رہائش اختیار کرلی۔ ہارلم کا علاقہ اُن دنوں کالوں کا گڑھ تھا۔

نیویارک میں میلکم لٹل کلبوں میں کام کرتا رہا اور بہتر ماحول نہ ہونے کی وجہ سے وہ نشوں کا عادی ہو گیا۔ اپنی اِس عادت کو پورا کرنے کیلیئے اُس نے چوری، غُنڈہ گردی اور لڑکیاں سپلائی کرنے جیسے غلط کام کرنا شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ اُس نے اپنا ایک گروہ بنالیا۔ انکا کام چوری، غُنڈہ گردی، نشہ آور اشیاء کی فروخت، راہ چلتے لوگوں کو لوٹنا اور لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرنا تھا۔ میلکم کے گروہ میں اُسکی ایک بہن اور گوری چمڑی والی گرل فرینڈ بھی شامل تھیں۔ 1945ء میں وہ ایک اپارٹمنٹ میں نقب زنی کی واردات میں پکڑا گیا اور اُسے دس سال قید کی سزا ہوئی۔ اُس وقت میلکم کی عُمر بیس برس تھی۔ میلکم اپنی آپ بیتی میں لکھتا ہے کہ نقب زنی کی سزا اتنی نہ تھی، دس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنے کی اصل وجہ اُس کے گوری لڑکیوں سے تعلقات تھے۔ جیل میں گذرنے والے دس سال میلکم کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوئے۔

میلکم لٹل کے بہن بھائی اور دوست چاہتے تھے کہ وہ غلط سوسائٹی سے نکلے اور اپنے آپ کو سنوارے۔ جب میلکم کو دس سال جیل کی سزا ہوئی تو اُنہوں نے دباؤ ڈالا کہ اب میلکم اپنی زندگی کو بدلنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ میلکم نے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس حیرت انگیز تبدیلی پر اُسے اصلاحی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اصلاحی جیل خانے میں لائبریری کی سہولت موجود تھی۔ میلکم نے اپنی طرزِ زندگی کو بدلنے کیلیئے کتابوں سے علم حاصل کرنا شروع کیا اور سب سے پہلے اپنی انگریزی زبان کو درست کیا اُس نے اپنی گفتگو کیلیئے اچھے الفاظ کا چناؤ کرنے کیساتھ ساتھ انگریزی زبان میں روانی پیدا کی۔ جیل کے اندر مختلف موضوعات پر مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ میلکم اِن میں حصہ لینے لگا اور جلد ہی وہ ایک اچھا مقرر اور مباحثہ کار بن گیا۔

ایک دن میلکم کا بھائی اُس سے ملنے آیا تو اُس نے بتایا کہ وہ عالیجاہ محمد کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا ہے۔ میلکم کے

بھائی نے اُسے بھی نیشن آف اسلام نامی تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی۔ "نیشن آف اسلام" نامی تنظیم کا موجد والس فارڈ محمد تھا۔ اُس نے 1930ء میں یہ تنظیم قائم کی، جس کا مقصد امریکہ اور باقی دُنیا میں سیاہ فام مردوں اور عورتوں کی روحانی، سماجی، ذہنی اور اقتصادی حالت کو بدلنا تھا۔ میلکم ایکس اپنی آپ بیتی میں لکھتا ہے کہ میں اپنے بھائی کی بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا اور اُس نے میلکم کو بتایا کہ وہ اب نہ تو جھوٹ بولتا ہے اور نہ ہی شراب پیتا ہے اور سؤر کا گوشت بھی نہیں کھاتا، کیونکہ اسلام میں ان سب کاموں سے منع کیا گیا ہے اور مسلمان یہ سب نہیں کرتے۔ میلکم کے دل کو بھائی کی بات اچھی لگی اور اُس نے جیل سے عالیجاہ محمد سے خط و کتابت شروع کر دی۔

میلکم اسلامی تعلیمات سے بیحد متاثر ہوا۔ 1952ء میں جب میلکم کی سزا پوری ہو گئی تو اُسے جیل سے رہا کر دیا گیا۔ یہ موسمِ بہار کے دن تھے اور میلکم نے سب سے پہلے عالیجاہ محمد کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اسلام قبول کیا اور نیشن آف اِسلام نامی تنظیم کا ممبر بن گیا۔ میلکم نے اسلامی نام ملک الشہباز رکھا مگر تاریخ میں وہ میلکم ایکس کے نام سے ہی جانا جاتا ہے، جب میلکم نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی تو اُس وقت اِس کا دائرۂ کار زیادہ وسیع نہیں تھا۔ میلکم کو تنظیم میں شمولیت کے بعد پتہ چلا کہ زندگی کیا ہے؟

نیشن آف اسلام کے بانی عالیجاہ مُحمد

میلکم غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اُس نے عالیجاہ محمد سے اسلامی تعلیمات کی تربیت حاصل کی اور پھر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ سیاہ فام لوگوں کی نفسیات سے واقف تھا اِس لئے وہ اُنہیں آسانی سے قائل کر لیتا تھا کہ ہماری اصلاح و فلاح عالیجاہ محمد کی بتائی ہوئی اسلامی تعلیمات سے ہی ممکن ہے۔ میلکم اب تیس برس کا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی غلامانہ زندگی کی ہر نشانی کو مٹا دینا چاہتا تھا، اِس لئے اُس نے اپنا نام میلکم لٹل کی بجائے میلکم ایکس رکھ لیا اور وہ کہتے تھے کہ میرے نام کیساتھ ایکس دراصل غُلامی پر کراس ہے اور میں نے ایکس سے غُلامی کو ختم کر دیا ہے۔

میلکم نے جب تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی تو اُس وقت تنظیم میں صرف چند مبلغ تھے اور اب اُسکی کوششوں اور محنت سے ان کی تعداد ستر کے قریب ہو گئی تھی۔ عالیجاہ محمد نے میلکم کی محنت سے متاثر ہو کر اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ میلکم ایک بہترین مقرر اور جاذب نظر انسان تھے اس لیے جلد ہی نیشن آف اسلام کے اہم رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ نیویارک میں ایک جھگڑے کی وجہ سے یہ تنظیم ذرائع ابلاغ کی نظروں میں آگئی جس کے بعد نیشن آف اسلام کو پریس میں بھی جگہ ملنے لگی۔ اس کے بعد میلکم ایکس "ناراض میلکم ایکس" کے نام سے مشہور ہو گیا کیونکہ وہ ہر مباحثے اور تقریر میں گوروں کو برملا برا بھلا کہتا اور سیاہ فاموں کی موجودہ حالت کا ذمہ دار انھیں ٹھہراتا تھا۔

عالیجاہ محمد ایک اچھے انسان تھے اور وہ گوروں سے کھلم کھلا دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ میلکم ایکس کی مقبولیت اور جذباتیت سے وہ گھبرا گئے اور پھر بہانہ بنا کر میلکم کو تنظیم سے علیحدہ کر دیا۔ میلکم اپنے درشت رویے کی وجہ سے "ناراض میلکم ایکس" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

میلکم نے ایک نرس بیٹی ایکس سے شادی کر لی اور اس سے میلکم کی چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ میلکم ایکس، عالیجاہ محمد اور محمد علی کلے (باکسر) تینوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ مگر میلکم نے تنظیم سے علیحدگی کے بعد محمد علی کلے سے بھی ملنا جلنا کم کر دیا۔ 1965ء میں محمد علی کلے کا سونی لٹسن سے ہیوی ویٹ باکسنگ کا مقابلہ تھا۔ محمد علی یہ مقابلہ کاسیس کلے کے نام سے ہی کر رہا تھا کیونکہ ابھی اُس نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ گورے اِس کو بنیاد بنا کر مقابلہ کینسل نہ کر دیں اور وہ گوروں سے یہ اعزاز چھین کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔ اِس مقابلے کیلئے تشہیر جاری تھی۔ عالیجاہ

محمد کا خیال تھا کہ محمد علی کلے یہ مقابلہ نہیں جیت سکتا، وہ ایک گورے کے مقابلے میں محمد علی کی حمایت کر کے گوروں اور کالوں میں نفرتوں کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اِس لئے وہ محمد علی کی حمایت سے کنارا کش ہو گیا۔ میلکم ایکس کی خواہش تھی کہ محمد علی کلے اِس مقابلے میں سونی لٹسن کو ہرائے تاکہ گوروں کی کالوں پر برتری کا تاثر ختم ہو۔ جس روز یہ مقابلہ ہوا، میلکم بغیر کسی خوف کے اسٹیڈیم پہنچا اور مقابلے کے دوران بیٹھا محمد علی کلے کی جیت کی دُعائیں مانگتا رہا۔ محمد علی کلے نے مقابلہ جیتنے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، جس سے امریکہ میں کھلبلی مچ گئی۔

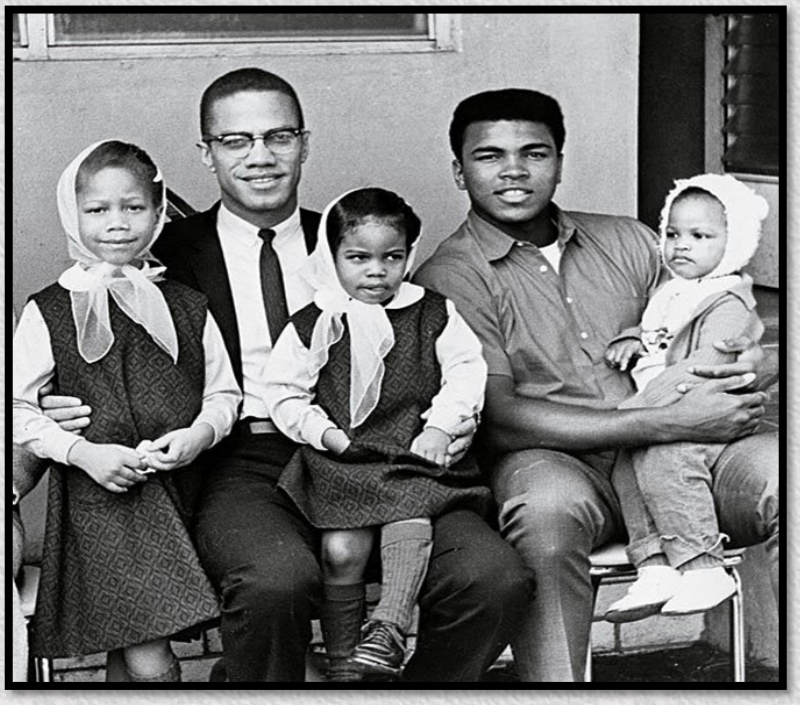

میلکم ایکس کی اپنی بیٹیوں اور محمد علی کلے کیساتھ ایک یادگار تصویر

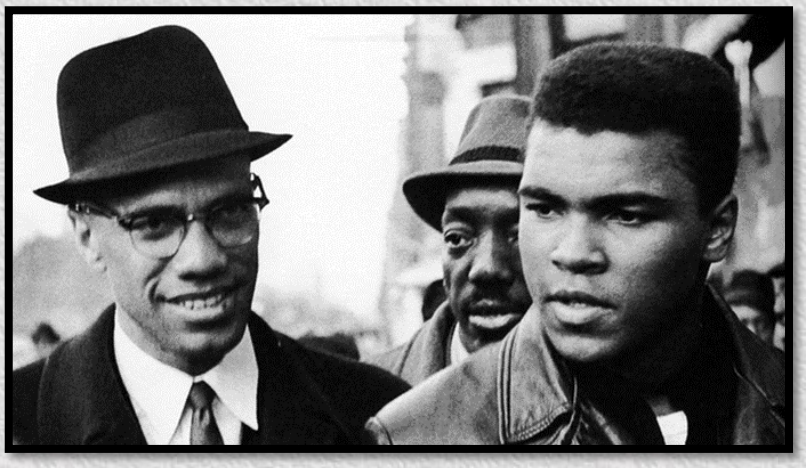

میلکم ایکس اور محمد علی کلے کی ایک یادگار تصویر

میلکم ایکس اسلام کے بارے میں اپنی تشنگی کم کرنے کیلیئے ڈاکٹر یوسف شورال سے ملا۔ جنہوں نے میلکم کو اسلام کے بارے میں تعلیمات سے آگاہ کیا اور اسلام اُس کی روح و دِل میں اُتر گیا۔ میلکم ایکس نے حج کا ارادہ کیا اور قاہرہ کے راستے جدہ کیلیئے روانہ ہوا۔ قاہرہ میں اُس کی ملاقات ڈاکٹر شورابی سے ہوئی، جنہوں نے میلکم کے دِل میں اسلام کے تصور کو اور واضح کیا۔ قاہرہ سے جدہ کو روانگی کے وقت نو مسلم ہونے اور امریکی پاسپورٹ کیوجہ سے اُسے ائیر پورٹ پر ہی روک لیا گیا۔ میلکم نے ڈاکٹر عُمر عزام سے فون پر بات کی اور اپنی پرابلم سے آگاہ کیا۔ اِس کے بعد میلکم کو سعودیہ میں سرکاری مہمان کا درجہ دیدیا گیا۔ میلکم نے فریضۂ حج ادا کیا اور دورانِ حج اُس کی ملاقات شاہ فیصل سے ہوئی جو اُس وقت ولی عہد تھے۔ میلکم ایکس سعودی حکومت کے شاہی مہمان رہے۔ حج کے دوران میلکم نے دیکھا کہ اللہ کی عبادت کیلیئے جاری اِس بھیڑ میں گورے، کالے اور مختلف نسل کے لوگ سب شامل ہیں۔ میلکم کو اس سے خوشی ہوئی کہ اسلام واقعی ایک سچا مذہب ہے کہ جس میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہیں ہے، اِس سے میلکم کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔

میلکم ایکس شاہ فیصل سے ملاقات کرتے ہوئے

حج سے واپسی پر میلکم ایکس کئی اسلامی اور افریقی ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے واپس امریکہ پہنچے۔ اپنے اِس سفر میں وہ جمال عبدالناصر، احمد بن بیلا اور کوامے نکروما سے بھی ملے۔ اِس دوران آپ نے سیاہ فاموں کو درپیش مسائل پر تبادلۂ خیال

کیا۔ امریکہ واپسی کے بعد میلکم نے اسلام کے بارے میں کھل کر لیکچر دینا شروع کر دیئے۔ میلکم کی تعلیمات نے جہاں اُس کے لاکھوں مداح پیدا کئے وہیں اُس کے دشمنوں کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ ہو گیا۔ وہ برملا کہتے تھے کہ مجھے ہر وقت اپنے دشمنوں سے جان کا خطرہ رہتا ہے مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ 21 فروری 1965ء کو میلکم نیویارک میں لیکچر دے رہے تھے کہ پہلی قطار میں بیٹھے تین دشمن اچانک اُٹھے اور میلکم پر ریوالور اور شارٹ گن سے فائر کھول دیا۔ اسلام کا یہ شیدائی اپنے لاکھوں مداحوں کو سوگوار چھوڑ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

وفات کے وقت میلکم ایکس کی عُمر چالیس سال تھی۔ میلکم کے مداحوں نے گوروں کو قبر کھودنے سے منع کر دیا اور سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ میلکم کا جنازہ شیخ الحاج ہشام جابر نے پڑھایا۔ اُسے فرنکلف کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

میلکم ایکس کی قبر پر لگے کتبے پر یہ الفاظ درج ہیں۔

"الحاج ملک الشہباز 29 مئی 1925ء تا 21 فروری 1965ء"

یہ تحریر میلکم ایکس کی آپ بیتی سے لی گئی ہے جو 1965ء میں شائع ہوئی اور پاکستان میں اسکا اردو ترجمہ شائع ہوا اور ٹائم میگزین نے اس کتاب کو بیسویں صدی کی دس بہترین غیر افسانوی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ 1992ء میں ہدایتکار اسپائک لی نے اُنکی زندگی کے بارے میں "میلکم ایکس" نامی فلم بنائی۔

کاسیس کلے

سیاہ فام کاسیس کلے سے مُحمد علی کلے تک

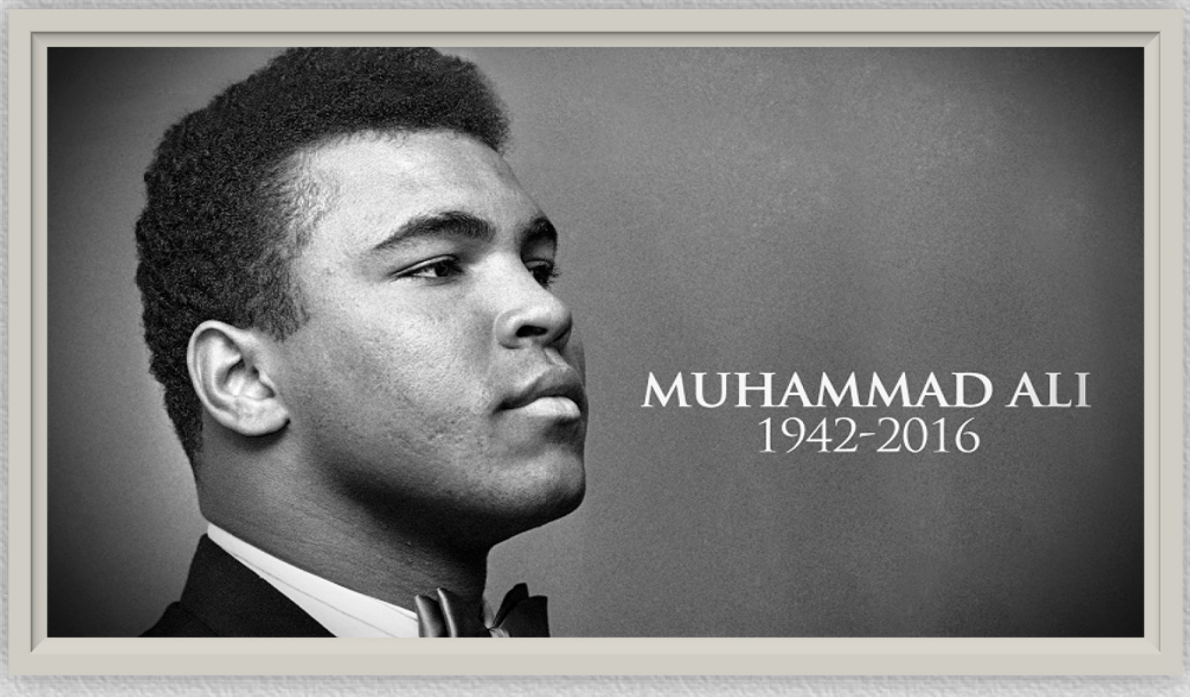

17 جنوری 1942ء کو امریکی ریاست کنٹکی کے شہر لوئیس ول کے پسماندہ علاقے میں سیاہ فام عیسائی گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے اُس کا نام کاسیس کلے رکھا۔ سیاہ فام ہونے کیوجہ سے گوروں کے زیرِ عتاب رہا۔ کاسیس کلے بارہ سال کا تھا جب لوئیس ول شہر کا سالانہ کنونشن ہوا، کنونشن میں میلے کا سا سماں ہوتا تھا، شہر کے لوگ بڑی دلچسپی سے اِس میں حصہ لیتے تھے۔ کاسیس کلے بھی اپنے ایک دوست کیساتھ بائیسکل لے کر وہاں گھومنے گیا۔ وہ بائیسکل باہر کھڑی کر کے کنونشن کے اندر چلے گئے اور خوب گھومے پھرے، انہوں نے وہاں آئسکریم اور پاپ کارن بھی کھائے۔ جب وہ باہر آئے تو کاسیس کلے کی بائیسکل چوری ہو چکی تھی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی گورا لڑکا چُرا کر لے گیا ہے۔ یہ سُن کر کاسیس کلے کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ شدید برہم ہوا۔ وہ ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر جومارٹن کے پاس شکایت درج کروانے گیا۔ وہ ہوا میں مُکا لہراتے ہوئے غُصے سے بولا کہ اگر چور اُسے مل گیا تو ایسی پٹائی کروں گا کہ اُسے نانی یاد آجائیگی۔ پولیس افسر جومارٹن باکسنگ جم میں انسٹرکٹر بھی تھا، اُسے کاسیس کلے کا جارحانہ انداز بہت پسند آیا۔ وہ بولا: لڑکے اگر تم واقعی لڑائی کرنا چاہتے ہو

تو پہلے باکسنگ سیکھو۔ کاسیس کلے کو جو مارٹن کا مشورہ پسند آیا اور وہ جو مارٹن سے باکسنگ سیکھنے لگا۔ بہت کم وقت میں کاسیس کلے ایک ماہر اور خطرناک باکسر بن چکا تھا۔ کاسیس کے دوست و احباب اُسکی کی کارکرگی پر حیران رہ گئے۔ وہ اپنے مقابل کو منٹوں میں شکست دیدیتا تھا۔ کاسیس کلے نے بارہ برس کی عُمر میں باکسنگ شروع کی اور 1960ء کے اولمپکس میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اولمپکس سے واپس آیا تو ایک ریستوران میں نوکری کیلئے گیا مگر اُسے گورے اور کالے میں نسلی تعصب کی وجہ سے نوکری نہ ملی۔ کاسیس کلے اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ اُس نے سونے کا تمغہ دریائے اوہائیو میں پھینک دیا۔ اٹھارہ برس کی عُمر میں کاسیس کلے نے پروفیشنل باکسنگ شروع کی اور 1963ء میں لندن میں برطانوی باکسر ہنری کوپر کو ہرایا۔

وہ گھر جہاں کاسیس کلے (محمد علی کلے) پیدا ہوئے

ایک دن یہ اعلان کرکے کاسیس کلے نے سب کو حیرت میں ڈال دیا کہ وہ سونی لسٹن سے مقابلہ کریگا۔ سونی لسٹن اُن دنوں ایک خطرناک اور خونخوار باکسر سمجھا جاتا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ سونی لسٹن کے سامنے نہیں ٹھہر پائیگا۔ 25 فروری 1964ء کو میامی بیچ فلوریڈا میں یہ مقابلہ طے پایا۔ مقررہ وقت پر جب دونوں کھلاڑی باکسنگ رنگ میں اُترے تو باہر بیٹھے تماشائی بڑی بے چینی سے رزلٹ کے مُنتظر تھے۔ کاسیس کلے نے میچ شروع ہوتے ہی سونی لسٹن پر تابڑ توڑ مکے برسانا شروع کر دیئے اور اُس کا یہ جارحانہ انداز چھٹے راؤنڈ تک جاری رہا۔ کاسیس کلے کے ہاتھوں خونخوار سونی لسٹن کی دُرگت بنتے دیکھ کر حیرانی سے لوگوں کی سانسیں رُک گئیں اور وہ اس لڑائی کا فیصلہ جاننے کیلئے بے چین تھے۔ تیسرے راؤنڈ میں کاسیس کلے کا مُکا سونی

لسٹن کی بائیں آنکھ کے اوپر پڑا اور گہرا زخم ہو گیا۔ زخم سے خون بہنے لگا تو اُسے ڈریسنگ آئنمنٹ لگا دی گئی۔ چھٹے راؤنڈ تک مار کھانے کے بعد سونی لسٹن نے اپنے ساتھیوں کے سامنے شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ وہ ساتویں راؤنڈ میں رنگ میں نہیں جائیگا۔ سونی لسٹن کے ساتھی اُسے مزید لڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ ایک معمولی سے باکسر سے شکست اُسے بدنام کر دیگی۔ ساتھیوں کے بڑھتے ہوئے اصرار کو دیکھ کر سونی لسٹن چیخ اُٹھا۔ "میں اب اور نہیں لڑ سکتا"۔ سونی لسٹن کے فیصلے پر ایمپائر نے کاسیس کلے کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ وہ اب ایک معمولی سے باکسر سے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن بن چکا تھا۔ اُسکے پرستار اُسے اُٹھائے ہوئے رقص کر رہے تھے۔ سونی لسٹن کے مداح کہتے ہیں کہ ڈریسنگ آئنٹمنٹ اُس کے دستانے سے لگ کر آنکھ میں چلی گئی جس سے سونی لسٹن کو آنکھ میں شدید چبھن ہوئی اور وہ مقابلے سے دستبردار ہو گیا۔ یہ سونی لسٹن کے کیریئر میں اُس کے چہرے پر آنیوالا پہلا زخم تھا۔

گوروں کے رویوں اور انسانی تفریق نے کاسیس کلے کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ عیسایت میں رہ کر اِس نسلی امتیاز کو ختم نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اُس کی راہنمائی کی کہ اُسے عالیجاہ اور میلکم ایکس جیسے مسلمان دوست مل گئے۔ یہ دونوں بھی اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے اور اب دینِ اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ کاسیس کلے اُنکی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ یہ بات کاسیس کے والد کاسیس مارسیلوز کلے تک پہنچی تو اُسے بیٹے کے مستقبل کی فکر ہوئی، اُس نے کاسیس کلے کے قریبی ساتھیوں سے ملکر اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہارا یہ اعلان تمہارا مستقبل برباد کر دیگا۔ آخر کار یہ طے پایا کہ مقابلے میں کامیابی کے بعد وہ اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے گا۔ چنانچہ 26 فروری 1964ء کو کاسیس کلے نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ کل کا کاسیس آج محمد علی کلے بن چکا تھا۔

محمد علی کلے کے اسلام قبول کرنے کی خبر اُس کے مداحوں پر بجلی بن کر گری اور اکثریت اُن کی مخالف ہو گئی۔ سونی لسٹن کے مداحوں نے خبر سُن کر اُسے مجبور کیا کہ وہ ایک بار پھر باکسنگ رنگ میں اُترے اور محمد علی کلے کو عبرتناک شکست دے۔ مداحوں اور اپنے قریبی دوستوں کے مشورے پر سونی لسٹن نے محمد علی کو چیلنج کر دیا۔ مقابلے کا اعلان نومبر 1964ء کو بوسٹن میں ہوا مگر اچانک تکلیف کی وجہ سے محمد علی کلے کو مقابلے سے تین دن پہلے ہرنیا کا آپریشن کروانا پڑا اور پھر منتظمین

نے مشورے سے 25 مئی 1965 کو لوئسٹن سٹی مین میں مقابلے کا اعلان کیا۔ دونوں باکسر بھرپور تیاری کیساتھ رنگ میں اُترے۔ مقابلہ شروع ہوا تو محمد علی کلے کے تابڑتوڑ حملوں سے سونی لسٹن گر گیا، ایمپائر نے محمد علی کلے کو کارنر میں جانے کیلئے کہا مگر اُس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ایمپائر جو ویلکاٹ گنتی شروع نہ کر سکا اور سونی لسٹن بیس سیکنڈ میں اُٹھ کھڑا ہوا، لڑائی دوبارہ شروع ہوئی تو چند سیکنڈ بعد ہی ایمپائر نے سونی لسٹن کی حالت کو دیکھتے ہوتے محمد علی کلے کو فاتح قرار دے دیا۔ باکسنگ رولز کے مطابق یہ ٹیکنیکل ناک آؤٹ تھا اور سونی لسٹن کے کچھ مداح اِسے متنازعہ فیصلہ بھی قرار دیتے ہیں۔

محمد علی کلے کا مکہ کھا کر سونی لسٹن گر گیا اور محمد علی کلے اُسے مقابلے کیلئے للکار رہے ہیں

سونی لسٹن سے دوبار جیت کر محمد علی کلے بحثیت باکسر پہچانا جانے لگا۔ مگر اصل شہرت محمد علی کلے کو اُسوقت ملی جب اُس نے ہیوسٹن میں ہونے والے ایک عالمی مقابلے میں کلیولینڈ ولیم کو بڑی مہارت سے شکست دی۔ کھیلوں کے مشہورِ زمانہ صحافی

ہاورڈ کوسل نے لکھا کہ یہ محمد علی کلے کی سب سے بہترین فتح تھی، اور اِس فتح کے بعد وہ ایک عظیم باکسر کے طور پر اُبھر کر سامنے آئے۔

محمد علی کلے نے اپنی باکسنگ لائف میں اکسٹھ مقابلے کئے، اور 56 میں کامیابی حاصل کی۔ اُنہوں نے تین مرتبہ عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن شپ کا ٹائٹل جیتا جو ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ محمد علی کلے کی زندگی کے دلچسپ اور مشہور واقعات کچھ یوں ہیں۔

محمد علی نے 1964ء میں عالیجاہ محمد اور میلکم ایکس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ تاریخی شواہد کے مطابق 1930ء میں والس ڈی فارڈ محمد نے نسلی امتیاز کے خلاف تحریک چلائی جسے "نیشن آف اسلام" کا نام دیا۔ پھر اس تحریک میں عالیجا محمد اور میلکم ایکس بھی شامل ہوگئے۔ نیشن آف اسلام نامی تحریک اسلام کا نیا روپ نہیں تھا بلکہ نسلی امتیاز کیخلاف ایک اسلامی تحریک کہا جاسکتا ہے۔ میلکم ایکس نے اِس تحریک کے اغراض و مقاصد جان کر علیحدگی اختیار کر لی تھی اور 1975ء میں عالیجاہ محمد کی وفات کے بعد محمد علی کلے باقاعدہ سُنی مسلم بن گیا۔

محمد علی کلے قبولِ اسلام سے پہلے "گریٹ کاسیس کلے" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مگر اسلام قبول کرنے کے بعد اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا: آج سے میرے نام کیساتھ "گریٹ" نہ لگایا جائے، کیونکہ گریٹ تو صرف میرا "رب" ہے۔

جِس دن کاسیس کلے نے اسلام قبول کیا اور محمد علی کلے کے نام سے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان ایک پریس کانفرنس میں کیا تو ایک امریک صحافی نے سوال کیا۔

کیا تم واقعی مسلمان ہو گئے ہو؟

محمد علی کلے نے جواب دیا۔ ہاں میں مسلمان ہو گیا ہوں۔

صحافی طنزاً بولا۔ ایک کالا مسلمان

محمد علی کلے نے فوراً جواب دیا۔ تم متعصب لوگ ہو، تم کسی عیسائی یا یہودی کو تو کالا نہیں کہتے، صرف مسلمان ہی کو کہتے ہو۔

امریکہ کی ویتنام سے جنگ شروع ہوئی تو امریکہ نے سیاہ فام لوگوں کو جنگ میں جھونکنے کیلئے لازمی فوجی بھرتی کا قانون بنایا۔ محمد علی کلے اُن دنوں اپنے محلے کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ ایک دن اُنہیں امریکن فوج میں بھرتی ہونے کیلئے کہا گیا تو اُنہوں نے جواب دیا۔ جِس طرح چرچ کا پادری مبلغ ہونیکی وجہ سے فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا، اُسی طرح میں بھی اِس پابندی سے آزاد ہوں۔ محمد علی کلے کا جواب سن کر امریکی اسٹیبلشمنٹ اور صدر جانسن اِسکے خلاف ہوگئے اور میڈیا نے الگ شور مچانا شروع کر دیا۔ کیونکہ یہ سب جانتے تھے کہ اِس ایک انکار سے سیاہ فاموں میں حکومت کیخلاف بغاوت پیدا ہو جائیگی۔

عدالتی ٹرائل میں محمد علی کلے کو پانچ سال قید اور دس ہزار ڈالر جرمانے کی سزا سنائی گئی اور باکسنگ کے تمام اعزازات واپس لے لئے گئے۔ سرکاری وکیل نے محمد علی کلے کو مشورہ دیا کہ اگر تم تحریری معافی نامہ داخل کر دو تو تمہاری قید اور جرمانہ ختم کر دیئے جائیں گے اور تمام اعزازات بھی واپس لوٹا دیئے جائیں گے۔ محمد علی کلے نے سرکاری وکیل کا مشورہ مسترد کر دیا۔ بعد میں سپریم کورٹ نے عوامی احتجاج کے پیشِ نظر اُن کی سزا منسوخ کر دی۔

محمد علی کلے نے اِس موقع پر اجتماع سے جو الفاظ کہے وہ تاریخ میں ہمیشہ کیلئے امر ہو گئے:

"یہ لوگ مجھے وردی پہنا کر دس ہزار میل دور بسنے والے پیلی رنگت کے ویتنامیوں پر بم برسانے اور گولیاں چلانے کیلئے بھیجنا چاہتے ہیں۔ جبکہ میرے شہر لوئیس ویل میں یہ ہمیں نیگرو کہتے ہیں اور ہمارے ساتھ کتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اور بُنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ لوگو! میری ویتنامیوں سے کوئی لڑائی نہیں ہے اور پھر وہ مُجھے نیگرو بھی نہیں کہتے۔ میں دس ہزار میل دور جا کر اُن غریب لوگوں کو مارنا یا جلانا نہیں چاہتا۔ یہ سفید فام لوگ جبر اور جنگ کر کے سیاہ فاموں کو اپنا غُلام رکھنا چاہتے ہیں۔ میں اِن لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جو آزادی کیلئے لڑنے والوں کو اپنا غُلام رکھنا چاہتے ہیں، میں اپنے مذہب اور اپنے لوگوں کی توہین نہیں کروں گا۔ اگر میں سمجھتا کہ میرے جنگ میں جانے سے میرے بائیس ملین سیاہ فام لوگوں کو آزادی مل جائیگی تو میں ضرور بھرتی ہو کر اِس جنگ میں چلا جاتا۔ اگر میں اپنے عقیدے کی بنا پر جیل میں چلا گیا تو کیا ہوا؟ میرے لوگ تو چار سو سال سے جیل میں ہیں"

یہی وہ الفاظ تھے کہ جن کی گہرائی کو ناپتے ہوئے سپریم کورٹ نے محمد علی کلے کی سزا کو منسوخ کر دیا، کیونکہ وہ ویتنام سے لڑتے ہوئے دوسری جنگ امریکہ میں نہیں لڑنا چاہتے تھے اور پھر یہ جنگ ویتنام کی جنگ سے کہیں زیادہ بھیانک ہوتی۔

انسانی حقوق کی آزادی کے عظیم رہنما مارٹن لوتھر کنگ نے بھی ویتنام کی جنگ کی مخالفت کی۔ اُس کے ساتھیوں نے اُسے معاملہ سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ اُس نے کہا: محمد علی کلے سچ کہتا ہے ہم سب سیاہ فام، غیر سفید فام اور غریب لوگ ایک ہی نظامِ جبر کا شکار ہیں۔ نیلسن منڈیلا جب قید میں تھے تو کہتے تھے، محمد علی کلے کو دیکھ کر میری اُمید بندھی رہتی ہے کہ ایک دن قید خانے کی سب دیواریں گر جائینگی۔

محمد علی کلے جب دوبارہ باکسنگ رنگ میں آئے تو اُن کا مقابلہ جو فریزر سے 8 مارچ 1971ء میں میڈیسن اسکوائر گارڈن نیویارک سٹی میں ہوا۔ مقابلہ پندرہ راؤنڈ تک ہوا اور متفقہ فیصلے سے جو فریزر کو فاتح قرار دیدیا گیا۔ اِس شکست کا سبب محمد علی کلے کا باکسنگ سے باہر رہنا تھا۔ محمد علی کلے نے اپنی شکست سے سبق سیکھا۔ 28 جنوری 1974ء کو محمد علی کلے اور جو فریزر میں دوبارہ میڈیسن اسکوائر گارڈن نیویارک سٹی مقابلہ ہوا۔ بارہ راؤنڈ تک چلنے والے اِس مقابلے میں محمد علی کلے فاتح قرار پائے۔ بی بی سی لندن ٹیلیویژن نے محمد علی کلے کو اِس صدی کا عظیم کھلاڑی قرار دیا اور اِس مقابلے کو صدی کا بہترین مقابلہ قرار دیا

دیا گیا۔ محمد علی کلے سے کے جارج فورمین اور انوکی کے مقابلے قابلِ ذکر ہیں۔ محمد علی کلے کا یہ فقرہ یادگار ہے۔ " تتلی کی طرح ناچو اور شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارو"

محمد علی کلے تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد وہ جب بھی مقابلے کیلئے رنگ میں اترے تو دُعا مانگتے تھے: "اے اللہ! تو علی کو مقابلے کیلئے تیار کر، تو جانتا ہے کہ لاکھوں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں ہار جاؤں، لیکن میں جانتا ہوں کہ تو میرے ساتھ ہے، میں نہیں ہار سکتا"

1980ء میں محمد علی کلے کو ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ پارکنسنس سنڈروم (رعشہ) کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اُنہوں نے چالیس سال کی عُمر میں باکسنگ کو خیر آباد کہہ دیا۔

محمد علی کلے کو 1996ء میں اٹلانٹا اولمپکس کی شمع اُٹھانے کا اعزاز حاصل ہوا، اور محمد علی کلے کو دوبارہ وہ تمغہ دیا گیا جو اُنہوں نے دریائے اوہائیو میں پھینک دیا تھا۔

محمد علی کلے 1996ء میں اٹلانٹا اولمپکس کی شمع اُٹھائے ہوئے

واک آف فیم کی جگہ پر مشہور لوگوں کے نام دستخط کے ساتھ زمین پر کندہ ہیں۔ محمد علی کلے کو بھی یہ آفر ہوئی تو اُنہوں نے کہا: میرے نام میں میرے پیارے نبی محمد ﷺ کا نام شامل ہے، میں نہیں چاہتا کہ اِس نام کو کوئی پاؤں تلے روندے، ہاں اگر تم لوگ اسے دیوار پر لگاؤ تو میں تیار ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور محمد علی کلے وہ واحد شخص ہیں کہ جن کا نام دیوار پر لگایا گیا ہے۔

واک آف فیم کی دیوار پر لگایا گیا واحد نام "محمد علی" دستخط کیساتھ

باکسنگ کو خیر آباد کہنے کے بعد محمد علی نے اپنی باقی زندگی اسلام، مسلمانوں اور غریبوں کیلئے وقف کر دی۔ رعشہ کے مرض میں مبتلا محمد علی کلے نے فلاحی کاموں پر بھی پوری توجہ دی اور حال ہی میں اپنے آبائی قصبے لوئسویل میں چھ منزلہ محمد علی سینٹر قائم کیا جہاں معاشرہ کے ہاتھوں ستائے ہوئے افراد کو دوبارہ بہتر شہری بنانے کا کام جاری ہے۔ محمد علی سینٹر میں مسلمانوں کی فلاح کے مختلف ادارے قائم ہیں۔

یہ محمد علی کلے ہی تھے کہ جنہوں نے بلا امتیازِ مذہب سیاہ فام لوگوں کو امریکی معاشرے میں عزت کا مقام دلوایا۔ اور یہ کہنا بھی کچھ غلط نہیں کہ اسی وجہ سے آج بارک اوباما کو ایک سیاہ فام امریکی صدر بننے کا موقع ملا۔

نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکی میڈیا نے مسلمانوں کے خلاف بڑی نفرت پھیلائی اور مسلمان مخالف لوگوں کے جذبات بھڑکائے۔ ردِ عمل کے طور پر یورپ اور امریکہ میں نسل پرستوں نے مسلمانوں کی املاک اور عبادت گاہوں پر آتشگیر مادے پھینکے۔ اِس پر بھی جذبات ٹھنڈے نہ ہوئے تو مساجد کی دیواروں پر اشتعال انگیز نعرے اور سؤر کا گوشت پھینکنے لگے۔

محمد علی کلے کے آبائی قصبے لوئی سول میں بنایا گیا محمد علی سینٹر

11 ستمبر کے واقعہ کے بعد محمد علی کلے نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں مرنے والوں سے یکجہتی کرنے کے لیے آئے تو ایک صحافی نے سوال کیا:

علی! تم کیسا محسوس کرتے ہو کہ دہشت گردوں کا تعلق بھی تمہارے مذہب سے ہے؟

انہوں نے برجستہ جواب دیا: پیارے! تم کیسا محسوس کرتے ہو کہ تمہارا، ہٹلر، میسولینی اور اسٹالن کا تعلق ایک ہی مذہب سے ہے؟

امریکی ٹیلیویژن اے بی سی کے نمائندے نے انٹرویو لیتے ہوئے محمد علی سے پوچھا: تمہاری پسندیدہ کتاب کونسی ہے؟

محمد علی بولے: ایک مسلمان سے یہ فضول سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان کی پسندیدہ کتاب صرف قُرآن ہے جو ایک بہترین زندگی گذارنے کا طریقہ بتاتی ہے۔

نمائندے نے دوسرا سوال پوچھا: تمہاری سب سے زیادہ پسندیدہ مسجد کونسی ہے؟

محمد علی کلے نے کہا: مُجھے ہر مسجد محبوب ہے کیونکہ سب کا رُخ کعبہ یعنی اللہ کے بڑے گھر کی طرف ہے۔

نمائندے نے تیسرا سوال پوچھا: تمہاری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کونسی ہے؟

محمد علی کلے نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: اللہ اکبر! میری سب سے بڑی کامیابی اسلام قبول کرنا ہے، جس نے مُجھے دُنیا و آخرت میں سرخرو کیا۔

عراق کویت جنگ کے دوران صدر صدام حسین نے بیس کے قریب امریکیوں کو بغداد کے حساس علاقوں میں سڑکوں پر کھمبوں کے ساتھ باندھ کر کھڑا کر دیا تھا تاکہ امریکا اُن علاقوں پر حملہ نہ کرے۔ امریکا نے اپنے تمام اتحادیوں کے توسط سے ان امریکیوں کی رہائی کیلئے ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر محمد علی کلے شدید علالت کے باوجود فوری طور پر بغداد میں عراقی صدر صدام حسین سے ملاقات کیلئے پہنچے اور صدام حسین نے فوری طور پر ان کی عزت افزائی کرتے ہوئے غیر مشروط طور پر تمام امریکیوں کو باعزت طریقے سے محمد علی کلے ساتھ امریکا رخصت کر دیا۔ بعد ازاں امریکی حملے کے وقت محمد علی کلے نے بھرپور احتجاج کرتے ہوئے امریکی انتظامیہ کو وعدہ خلاف، مکار اور بد دیانت قرار دیا۔

امریکا میں صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ جو مسلمانوں کیلئے تند و تیز زبان استعمال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ محمد علی کلے نے اپنے ایک بیان میں اُسے نفرت انگیز زبان استعمال سے منع کرتے ہوئے پیغام دیا:

ڈونلڈ ٹرمپ! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم ایسا کرنے سے پہلے ایک مرتبہ اسلام کا مطالعہ ضرور کرو۔

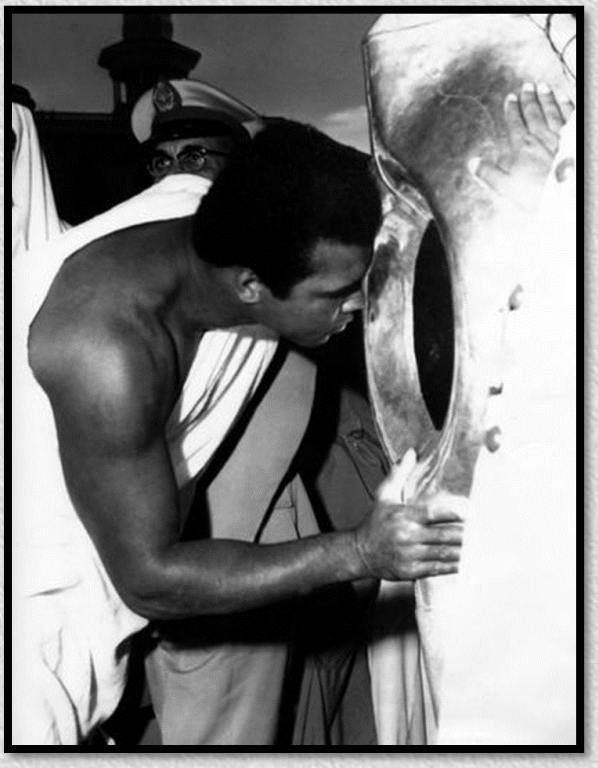

محمد علی کلے حجر اسوّد کو بوسہ دیتے ہوئے

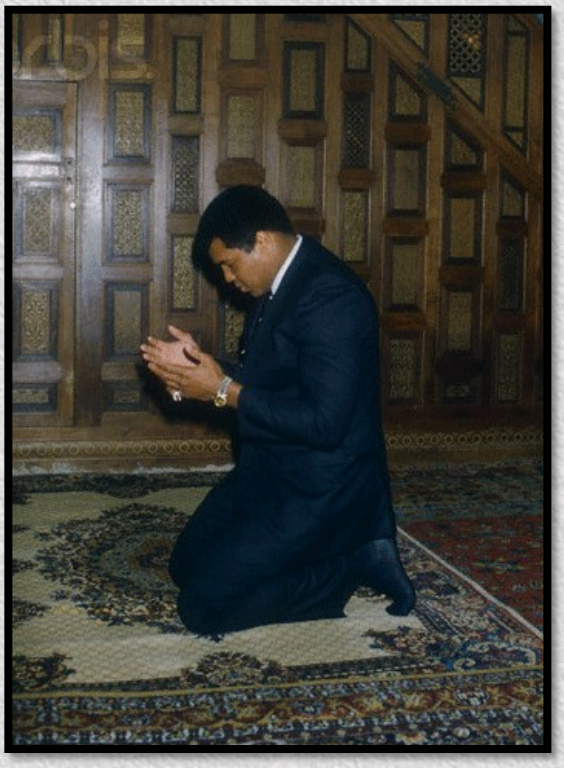

محمد علی کلے نماز ادا کرتے ہوئے

1972ء میں محمد علی کلے نے فریضۂ حج ادا کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب محمد علی کلے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اللہ کے گھر کا طواف کرنیوالوں میں دُنیا بھر سے آئے ہوئے ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود تھے۔ محمد علی کلے باکسر کو جاننے والوں نے اُسے اپنے ساتھ پا کر ڈھیروں پیار نچھاور کیا۔ محمد علی کلے بھی اُن میں گھل مل گئے اور آج اُنہیں احساس ہوا کہ اسلام میں رنگ و نسل کی تفریق کئے بغیر کتنی اپناہیت ہے۔

جو لوگ کہتے تھے کہ محمد علی کلے نے اسلام قبول کر کے اپنا مستقبل تاریک کر لیا، وہ دیکھ لیں کہ اللہ ہی جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت سے دوچار کرے۔

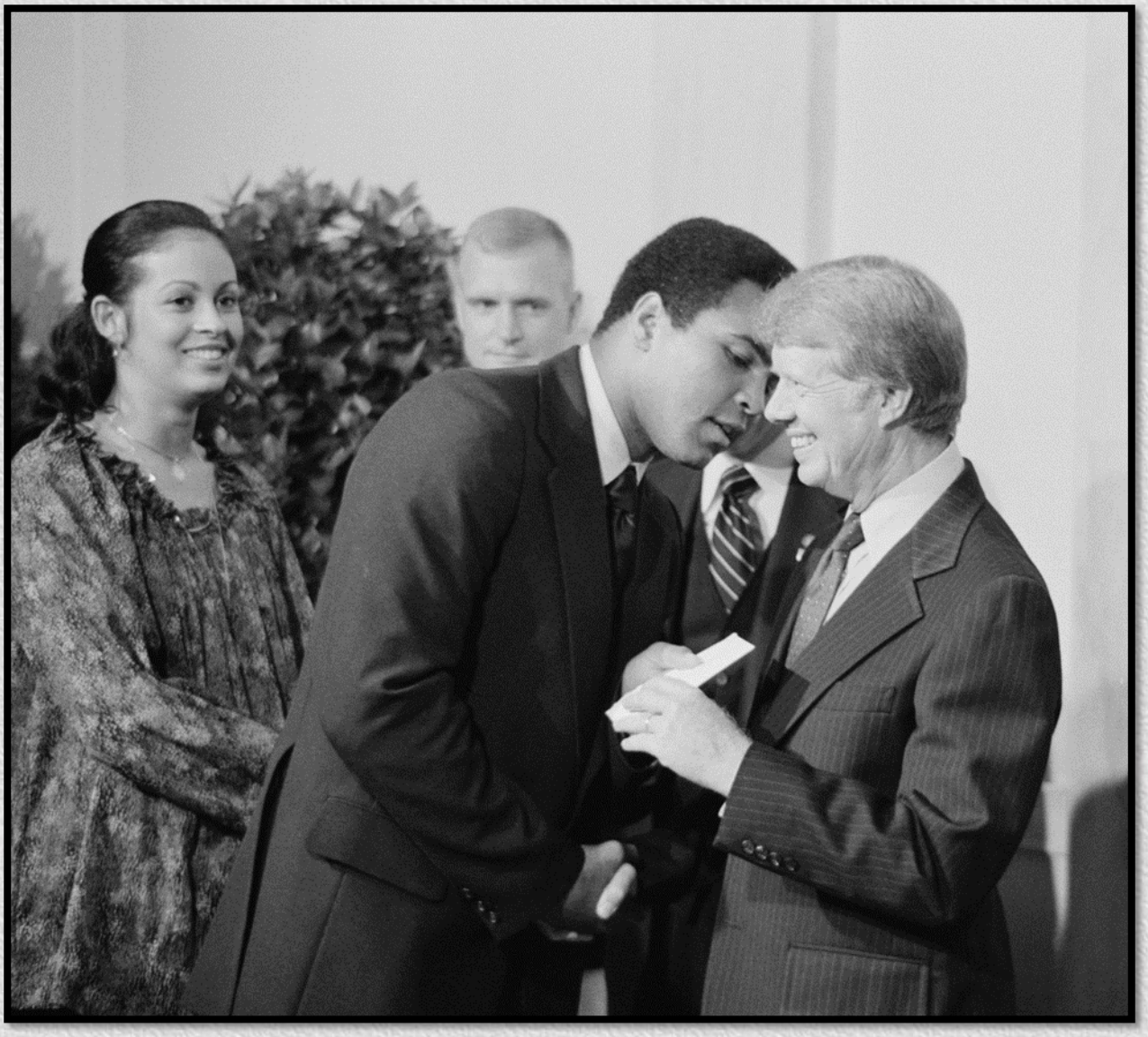

محمد علی کلے امریکی صدر جان ایف کینیڈی سے مصافحہ کرتے ہوئے

محمد علی کلے امریکی صدر بِل کلنٹن کیساتھ

2005ء میں امریکی صدر جارج بُش محمد علی کلے کو صدارتی تمغہ برائے آزادی پہناتے ہوئے

محمد علی کلے پہلے سیاہ فام امریکی صدر بارک اوباما کیساتھ

محمد علی کلے امریکی قیدیوں کی رہائی کے موقع پر عراقی صدر صدام حُسین کیساتھ

محمد علی کلے چوتھی ساؤتھ ایشین گیمز اسلام آباد پاکستان میں مہمانِ خصوصی تھے

محمد علی کلے اپنی پہلی بیوی سونجی روئی کیساتھ

محمد علی کلے کو اللہ تعالیٰ نے عزت، شہرت اور وقار دیا۔ اُس نے امریکہ میں گورے اور کالے میں تفریق ختم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی زندگی غریبوں اور دُکھی لوگوں کیلئے وقف کر دی۔ اُنہوں نے نہ صرف اسلام کی تبلیغ کی، بلکہ بہت سے اسلامی فلاحی اداروں کی مدد بھی کی اور کئی ایک مساجد تعمیر کروائیں۔

محمد علی کلے نے چار شادیاں کیں۔ محمد علی کلے نے پہلی شادی 14 اگست 1964ء میں سونجی روئی سے ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی اور 10 جنوری 1966ء کو باہمی رضامندی سے طلاق ہو گئی۔

17 اگست 1967ء میں محمد علی کلے نے دوسری شادی بلنڈا بوئنڈ سے ہوئی۔ شادی کے بعد بلنڈا بوئنڈ نے اسلام قبول کر لیا اور خلیلہ علی نام رکھا۔ خلیلہ علی سے محمد علی کلے کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہیں۔ خلیلہ علی اور محمد علی میں 1977ء میں طلاق ہو گئی

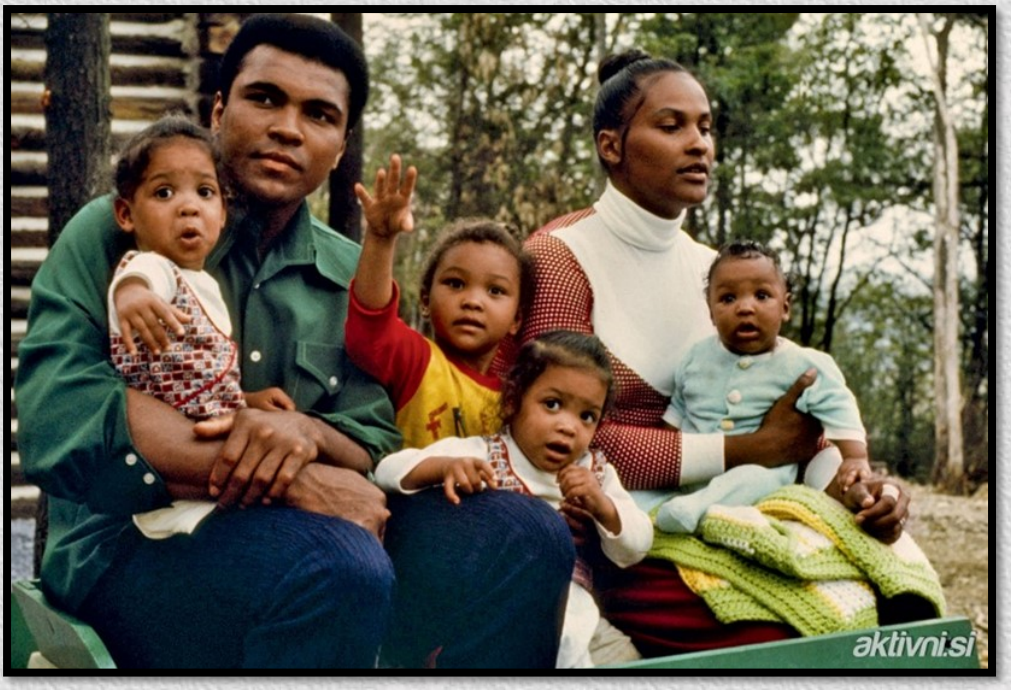

محمد علی کلے، بیوی خلیلہ علی، بڑی بیٹی مریم، جڑواں بیٹیاں جمیلہ اور راشدہ اور بیٹا محمد علی جونئیر

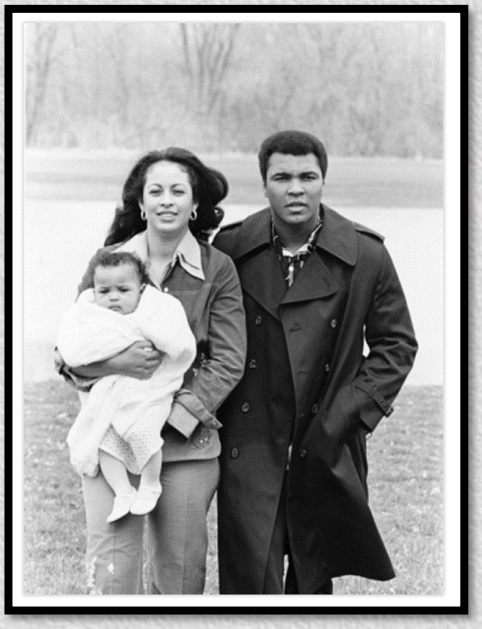

محمد علی کلے تیسری بیوی ویرونیکا پورش، بیٹی حنا کیساتھ

اسی سال محمد علی نے ویرونیکا پورش نامی ایک ایکٹریس سے شادی کر لی۔ ویرونیکا پورش کی بیٹی حنا محمد علی کی سوتیلی بیٹی تھی۔ دوسری بیٹی لیلیٰ محمد علی سے شادی کے بعد پیدا ہوئی۔

چوتھی شادی یولنڈا ویلیمز سے 1986ء میں کی، جو مرتے دم تک ساتھ رہی۔ محمد علی اور یولنڈا ویلمز نے باہمی رضامندی سے ایک پانچ ماہ کا بچہ گود لیا جس کا نام اسعد امین ہے۔

محمد علی کلے اپنی چوتھی بیوی یولنڈا ویلیمز کیساتھ

گذشتہ کئی سالوں سے رعشے کے مرض میں مبتلا محمد علی کلے نے فلاحی کاموں پر بھی پوری توجہ دی اور حال ہی میں اپنے آبائی قصبے لوئس ویل میں چھ منزلہ محمد علی سینٹر قائم کیا جہاں معاشرہ کے ہاتھوں ستائے ہوئے افراد کو دوبارہ بہتر شہری بنانے کا کام جاری ہے۔ ایک مشہور شخصیت، ایک باغی، ایک کامل مسلمان، حقوق انسانی کے علمبردار اور ایک شاعر، جس نظر سے بھی دیکھا جائے، محمد علی نے ہمیشہ کھیل، نسل پرستی اور قومیت کو شکست دی اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب محمد علی کرہ ارض پر بلا شبہ سب سے زیادہ شہرت یافتہ شخص بن گئے۔ دنیا ہمیشہ انہیں ایک عظیم شخص کے نام سے جانتی رہے گی۔ مسلمان اور سیاہ فام آج بھی محمد علی کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔۔(العمران 143)

اور تم موت سے پہلے اس کی ملاقات کی آرزو کرتے تھے سو اب تم نے اسے آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا۔

ربِ کریم سے دُعا ہے کہ وہ مُحمد علی کلے کی مغفرت فرمائے اور اُن کے درجات کو بلند فرمائے۔

مشکل ترین دور میں انہوں نے مسلمان ہونے کی بناء پر امریکہ کی ویت نام کے خلاف جنگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ نہ صرف اسلام کا پرچار کرتے رہے، بلکہ کئی اسلامی اداروں کو بھاری مالی امداد فراہم کرتے رہے اور مساجد کی تعمیر بھی کرواتے رہے۔ وقت گزرتا رہا اور مخالفین خود ہی شرمندہ ہوتے گئے اور محمد علی کو اُن کا کھویا ہوا مقام بالآخر دوبارہ مل گیا اور آج پھر امریکہ سمیت سارا مغرب انہیں کھیل کی دنیا کی عظیم ترین شخصیت قرار دے رہا ہے۔

صدی کے عظیم کھلاڑی کے انتقال پر کرکٹ کے عظیم کھلاڑی عمران خاں نے گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے سماجی رابطہ کی ویب سائٹ ٹویٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "محمد علی کی وفات کی خبر پر انتہائی دکھ ہوا، وہ نہ صرف عظیم ترین کھلاڑی تھے، ہ وہ انتہائی باصلاحیت، بیحد ذہین اور بہادر انسان تھے۔"

اسکپ ایسٹس

ایک کیتھولک پادری کا قبولِ اسلام

''اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿الشوریٰ۔13﴾''

اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ میں برگزیدہ کرلیتا ہے اور جو اُس کی طرف رجُوع کرے، اُسے اپنے راستے پر چلا دیتا ہے۔

1944ء میں امریکہ کی ریاست اوہائیو کے ایک کٹر پروٹسٹنٹ عیسائی گھرانے میں ایک بچے کی پیدائش ہوئی۔ والدین نے اِس کا نام اسکپ ایسٹس رکھا۔ اسکپ ایسٹس کا بچپن ٹیکساس میں گذرا اور وہیں پل بڑھ کر جوان ہوا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے آپ ایک چرچ میں پادری رہے اور کچھ وقت موسیقار کے طور پر بھی گُذارا۔ اُن کے والد آلاتِ موسیقی اور چرچ کی تزئین و آرائش کی اشیاء کاروبار کرتے تھے۔ اسکپ ایسٹس بھی اِس کاروبا میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ کاروبار کیلئے اشیاء وہ ملکی اور غیر ملکی کمپنیوں سے حاصل کرتے تھے۔

اسکپ ایسٹس سے شیخ یوسف ایسٹس کا سفر کیسے طے کیا وہ خود بیان کرتے ہیں:

مسلمان اور عیسائی مجھ سے اکثر سوال کرتے ہیں کہ میں مسلمان کیوں ہوا؟

ایک عیسائی ہونے کے ناطے سے جو تعلیم مجھے دی گئی وہ یہ تھی کہ مسلمان اچھے نہیں ہوتے، وہ خدا کو بھی نہیں مانتے۔ وہ صحرا میں موجود ایک سیاہ ڈبہ نما عمارت کی پرستش کرتے ہیں اور دن میں پانچ بار اُس کیجانب رُخ کر کے سجدے کرتے ہیں اور یہ دہشت گرد اور اغواء کار بھی ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بچے کے ذہن میں بچپن سے ہی مسلمانوں کیخلاف نفرت ڈال دیجاتی ہے اور نفرت کے اِس سمندر سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میرے والد جوزف ایسٹس بھی پادری تھے لیکن وہ مذہب پر کاروبار کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم مذہبی تبلیغ کیساتھ چرچ کی تزئین و آرائش کے سامان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ ہمارا کاروبار ٹیکساس اور ڈیلاس کی ریاستوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اِس کے علاوہ ہم ہاتھ سے بنی ہوئی مختلف اشیاٗ لوگوں سے خرید کر انہیں اچھے داموں فروخت کر دیتے تھے۔ ہمارا بزنس عیسائیوں تک ہی محدود تھا۔

یہ 1991ء کی بات ہے کہ ایک روز میرے والد صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ قاہرہ (مصر) کے ایک تاجر کیساتھ کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ تاجر ایک بین الاقوامی کمپنی کا مالک ہے۔ قاہرہ دریائے نیل کنارے آباد ایک تاریخی شہر ہے، اور دنیا کے عجوبے اہرامِ مصر کی وجہ سے مشہور ہے۔ مجھے والد صاحب کی بات سن کر از حد خوشی ہوئی مگر جب میرے والد نے بتایا کہ وہ شخص مسلمان ہے تو مجھے حیرت اور مایوسی ہوئی۔

میرے ذہن میں بچپن سے ہی مسلمانوں کے خلاف نفرت بھر دی گئی تھی اِس لئے میں نے مصری تاجر کیساتھ کاروبار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ والد صاحب نے کئی بار مجھے کہا کہ میں کم از کم ایک بار اُس شخص سے مل تو لوں وہ بہت نفیس اور اچھا انسان ہے۔ آخر میں نے ملاقات کیلئے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میرے والد بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اتوار کے روز اُسے اپنے گھر مدعو کر لیا۔ جب چرچ سے عبادت کے بعد میں گھر واپس آیا تو بائیبل کا تھیلا میرے کندھے پر اور صلیب ہاتھ میں تھی کیونکہ میرے تصور میں تھا کہ مسلمان تاجر سفید جبہ پہنے سر پر عمامہ رکھے ہوئے ہو گا، لمبی او گھنی داڑھی ہو گی اور ہاتھ میں تلوار تھامے ہوئے ہو گا۔ میں والد کے اسٹور میں داخل ہوا تو مجھے وہاں ایسا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے حیران ہو کر والد

سے اُس شخص اے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کرسی پر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارا مہمان ہے۔ ایک عام سا شخص ہمارے جیسا لباس پہنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو وہ اُٹھ کر بڑے تپاک سے ملا اور مُسکراتے ہوئے بولا:

میرا نام محمد عبدالرحمٰن ہے۔

میں مہمان کے پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا مگر دل میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ ہمیں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ مسلمان خدا اور اُس کے رسُولوں پر یقین نہیں رکھتے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنی کیفیت پر قابو پا کر اپنے مہمان عبدالرحمٰن سے پوچھا:

کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟ جی ہاں! عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔

کیا تم موسیٰ علیہ السّلام کو خدا کا پیغمبر مانتے ہو؟ جی ہاں! بلاشبہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں۔

پھر تو تم ادریس علیہ السّلام اور داؤد علیہ السّلام پر بھی یقین رکھتے ہو گے؟ بیشک یہ سب خدا کے نبی ہیں۔ عبدالرحمٰن نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

عبدالرحمٰن کے جوابات نے بلاشبہ مجھے بہت متاثر کیا۔ میں اب اُس سے عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق سوال کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ مسلمان بھی یہودیوں کی طرح عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق غلط عقائد رکھتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے دانستہ طور پر لفظ "عیسیٰ" پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہم مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر بھی دیگر پیغمبروں کی طرح یقین رکھتے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔ مصری تاجر سے ملاقات اور باتیں مجھے بہت اچھی لگیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں جلد ہی اسے عیسائیت کی جانب راغب کر لوں گا۔

میں نے والد صاحب سے کہہ کر اسے کرائے کا مہمان بنا لیا اور اُسے ساٹھ ڈالر ماہانہ کرایہ پر گھر میں ایک کمرہ دیدیا۔ امریکہ جیسے ملک میں ساٹھ ڈالر کرایہ ایک معمولی سی رقم تھی مگر میرا مقصد عبدالرحمٰن کو عیسائی بنانا تھا۔

عبدالرحمٰن ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اور اُسے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں بھی وسیع معلومات تھیں۔ جب بھی

ہماری نشست جمتی تو میں اُس کے سامنے عیسائیت کی تبلیغ کرتا اور وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہتا۔ جب میں اُس سے کسی موضوع پر بحث کرتا تو وہ نہایت مدلل انداز میں میرے تمام سوالوں کے جواب دیتا۔ میں عبدالرحمٰن کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ ہم اکثر سیر و تفریح کیلئے نکل جاتے تھے۔ میں دیگر لوگوں سے عبدالرحمٰن کے رویے پر حیران رہ جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن کی قرابت نے میرے دل سے مسلمانوں کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں دور کر دیں۔

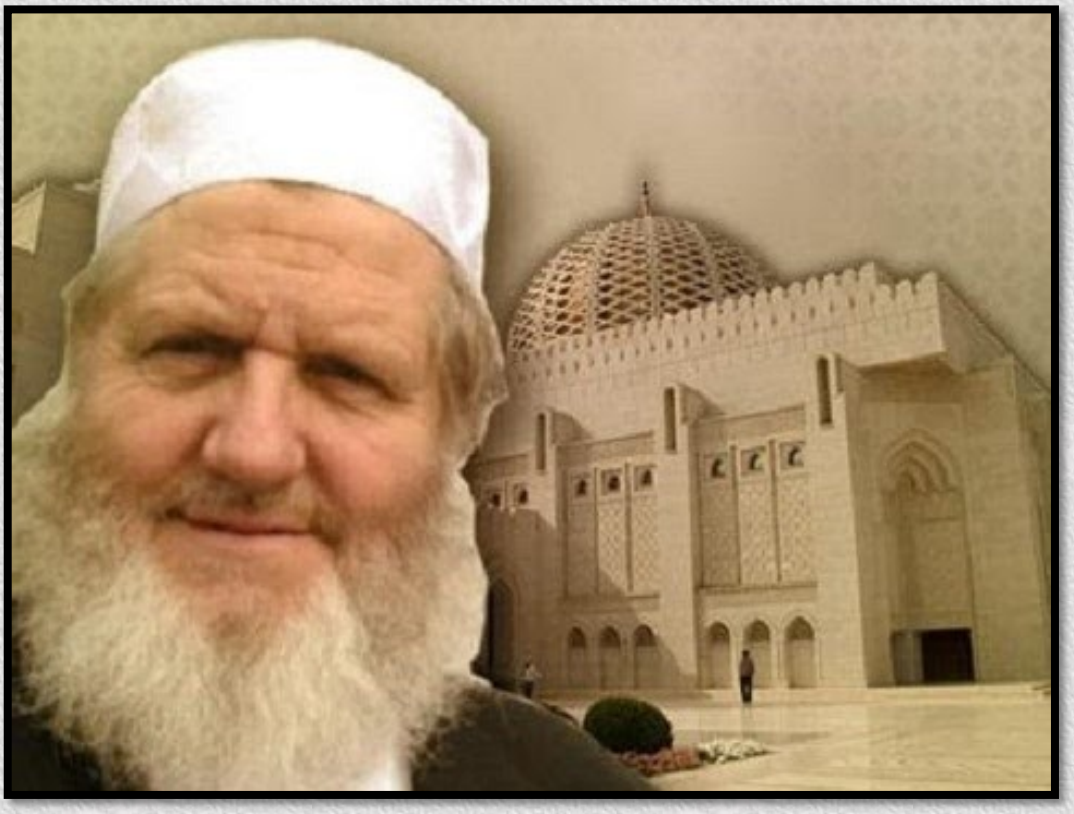

ایک روز کا ذکر ہے کہ وینس (اٹلی) سے ایک کیتھولک پادری ہمارے ہاں آیا۔ اب میں عبدالرحمٰن کے ساتھ اُس کیتھولک عیسائی کو بھی پروٹسٹنٹ بنانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ ایک روز ہم محفل جمائے بائیبل اور گناہوں سے بخشش کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ میرے والد صاحب کے پاس بائیبل کا "کنگ جیمز" نسخہ تھا اور میرے پاس 1953ء کا "اسٹنڈرڈ ریوائس ورژن" تھا۔ جب میں نے بخشش کے موضوع پر بات شروع کی تو میرے والد نے میری دلیل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ میرے نسخے میں یہ باتیں موجود نہیں ہیں۔ میری بیوی "گڈ نیوز فار ماڈرن" نامی نسخہ اُٹھا لائی مگر اُس نے بھی میری بات سے اختلاف کیا۔ ہمارے مہمان کیتھولک پادری کے پاس بائیبل کا نہایت قدیم نسخہ تھا۔ اُس نے بھی میری معلومات کو غلط

قرار دیدیا۔ ہم چاروں اپنے اپنے نسخے کو مستند قرار دینے کی بحث میں الجھ گئے۔ اچانک مجھے اپنے پاس بیٹھے ہوئے عبد الرحمٰن کا خیال آیا جسے بحث میں اُلجھ کر ہم فراموش کر بیٹھے تھے۔

میں نے عبد الرحمٰن سے پوچھا: تمہاری مقدس کتاب قُرآن پاک کے کتنے نسخے ہیں؟

ہماری کتاب قُرآنِ پاک عربی زبان میں ہے۔ اِس کے اربوں نسخے ہیں مگر چودہ سو برس بعد بھی اِس میں ایک بھی حرف کی ترمیم نہیں کی گئی۔ تمام مسلمان ایک ہی کتاب قُرآن پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے اُٹھایا ہے۔ مصری تاجر عبد الرحمٰن کی بات سن کر میں حیران رہ گیا کہ اُنکی کتاب "قُرآن" چودہ سو سال سے اپنی حقیقی عبارت میں محفوظ ہے جبکہ بائیبل کے درجنوں ترمیم شدہ نسخے دستیاب ہیں۔ عبد الرحمٰن کی بات نے میرے دل میں بائیبل کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے اور میرے دل میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں جستجو پیدا ہوئی۔

ایک روز میں اور عبد الرحمٰن بیٹھے تھے کہ میں نے پوچھا:

عبد الرحمٰن! اسلام میں خدا کا کیا تصور ہے؟

عبد الرحمٰن نے مجھے سورۂ اخلاص انگریزی ترجمے کیساتھ سنائی۔ میں تو تثلیث پر یقین رکھتا تھا کہ خدا تین ہیں مگر قُرآن کہہ رہا ہے:

کہو! وہ معبودِ برحق جس کی میں عبادت کرتا ہوں اللہ ہے، وہ ایک ہے۔

اللہ بے نیاز ہے۔

نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔

اور اُس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

سورۂ اخلاص سن کر عیسائیت میں مسلمانیت کی نمو ہونے لگی۔ اسلامی تعلیمات میں ہماری دلچسپی دیکھ کر عبد الرحمٰن ہمیں آہستہ آہستہ دینِ اسلام سے آگاہ کرنے لگا۔

ایک دن میں نے پوچھا عبد الرحمٰن! تمہاری عبادت کا کیا طریقہ ہے؟

ہم مسلمان ہر روز پانچ وقت مسجد میں اللہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ عبد الرحمٰن نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا: کیا دورانِ نماز موسیقی بھی ہوتی ہے؟

نہیں! مسجد میں نماز امام کی اقتدا میں خاموشی کیساتھ ادا کی جاتی ہے۔

میرے والد عبدالرحمٰن سے بیحد متاثر ہو چکے تھے اور وہ ہر صورت میں اِس کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن عبدالرحمٰن ٹیکساس کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اُس کیساتھ ایک شخص تھا جو سفید جبہ اور ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ ہمارا مہمان کیتھولک پادری تھا۔ اُس نے میرے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا اور بولا:

میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور میرا اسلامی نام یحییٰ ہے۔ اپنے مہمان کی بات سُن کر میں چکرا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں تو اِس مصری تاجر عبدالرحمٰن کو عیسائی بنانا چاہتا تھا، اور اُس نے ایک پادری کو مسلمان بنا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس وقت میرے دل میں بھی اسلام کی محبت جاگ اُٹھی تھی۔

اسی کشمکش میں گھر پہنچا تو میری بیوی نے ایک زوردار دھماکا کر دیا۔

اسکپ! مجھے طلاق چاہئیے۔

میں سمجھا کہ شائد یہ میرے ارادوں کو بھانپ چکی ہے اسی لئے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ مگر میں تو مسلمان نہیں ہو رہا، مجھے تو مسلمان سخت ناپسند ہیں۔ میں نے اپنے جذبات کو چھپانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے طلاق دیدو یا پھر میں اپنے وکیل کو بلاتی ہوں۔ آخر ایک مسلمان عورت کیسے ایک عیسائی مرد کی بیوی رہ سکتی ہے۔

ایک اور بم پھٹا کہ میری بیوی بھی مسلمان ہو چکی تھی۔ میں فوراً نیچے آیا اور عبدالرحمٰن کو باہر بلا لیا۔ ہم ساری رات اسلام کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ نمازِ فجر کا وقت ہو چکا تھا اس لئے عبدالرحمٰن نماز پڑھنے چلا گیا۔

میں جان چکا تھا کہ سچ غالب آ چکا ہے اور اب میری باری ہے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مسلمانوں کے قبلۂ کی جانب رُخ کر کے سجدہ ریز ہو گیا۔ میں نے دُعا مانگی: اے اللہ اگر تو یہاں موجود ہے تو مجھے سیدھا رستہ دکھا دے۔ میں نے سجدے سے سر اُٹھایا تو نہ روشنیوں کا سمندر، نہ موسیقی کی آواز اور نہ پرندوں کی چہچہاہٹ، میرا دل بدل چکا تھا۔ میں نے اِس نیت سے غسل

کیا کہ میرے گناہ دُھل جائیں گے۔ اب میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنیوالا تھا۔

میں عبدالرحمٰن کو ساتھ لیکر مسجد پہنچا اور گیارہ بجے عبدالرحمٰن کی موجودگی میں امام مسجد کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ چند ماہ بعد میرے والد صاحب نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے بچوں کو عیسائیوں کے اسکول سے نکال کر مسلمانوں کے اسکول میں داخل کروا دیا۔ میرے بچے دنیاوی تعلیم کے ساتھ قُرآن حفظ اور اسلامی تعلیم بھی حاصل کرنے لگے۔

میں (شیخ یُوسف ایسٹس) نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی زندگی تبلیغِ اسلام کیلئے وقف کر دی۔ اب تک بہت سے عیسائی، بدھ مت، ہندو اور یہودی میری تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر چکے ہیں۔

دائرہِ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر شیخ یُوسف ایسٹس نے مصر، ترکی اور مراکش سے عربی زبان سیکھنے کے علاوہ دینی علوم پر بھی دسترس حاصل کی۔ 2004ء سے آپ "پیس ٹی وی اور ہُدیٰ ٹی وی" پر باقاعدگی سے لیکچر دے رہے ہیں۔ آپ نے اب اپنا چینل "گائیڈ اَس ٹی وی" بھی متعارف کروایا ہے۔ 2005ء میں آپ حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

شیخ مختوم بن محمد بن راشد المختوم (دبئی کے نائب حکمران) 8 اگست 2012ء کو ڈاکٹر شیخ یُوسف ایسٹس کو سال کی بہترین اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ یُوسف ایسٹس نو مسلم حسن اور نو مسلمہ نیکول کوئین کیساتھ گائیڈ اَس ٹی وی پر

گائیڈ اَس ٹی وی ڈاکٹر شیخ یُوسف ایسٹس کی زیرِ نگرانی اسلام کیلئے خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ شیخ یُوسف اِس ٹی وی کے بانی ہیں۔ نیکو کوئین "گائیڈ اَس ٹی وی" پر نو مسلموں سے انٹرویو کرتی ہیں۔

فرینینڈلیوس ایلسن ڈور

باسکٹ بال کھلاڑی کریم عبدالجبار کی کہانی

باسکٹ بال کے عظیم کھلاڑی فرینینڈلیوس ایلسن ڈور16 اپریل 1947ء میں نیویارک میں پیدا ہوئے۔ اُنکا خاندان رومن کیتھولک عیسائی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ فرینینڈلیوس ایلسن ڈور نے 1968 میں اسلام قبول کیا اور اپنے لئے اسلامی نام کریم عبدالجبار پسند کیا۔ کریم عبدالجبار اپنی کہانی کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

میں 16 اپریل 1947 میں نیویارک کے رومن کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوا، جو نیویارک میں رہائش پذیر تھا۔ میرے آباؤاجداد افریقہ سے غلام بن کر امریکہ آئے تھے اور ہمارے آقاؤں نے ہمیں خاندانی نام ایلسن ڈور عطا کیا۔ میرے والدین نے میرا نام فرینینڈلیوس رکھا اور اس طرح میں فرینینڈلیوس ایلسن ڈور بن گیا۔ اسکول میں تھا تو گوری چمڑی والے مجھے سیاہ فام ہونے کی وجہ سے تضحیک کا نشانہ بناتے تھے۔ جب میں نوجوانی میں پہنچا تو میرا شعور بیدار ہو گیا۔ مجھے یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ امریکی معاشرے میں عزت سے جینے کیلئے مجھے بڑا مقام حاصل کرنا ہو گا ورنہ پھر ساری زندگی ذلت و رُسوائی سے گذارنا ہو گی۔ مُجھے باسکٹ بال کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑا بننے کے جذبے نے مجھ میں جنون بھر دیا اور میں باسکٹ بال

میں جارحانہ انداز میں ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اب میرا نام اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگا۔

امریکہ میں متعصب روّیے کی وجہ سے سیاہ فاموں میں نسل پرستی کے جذبات عروج پر تھے، مگر میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نسل پرستی سے میں معاشرے میں عزت کا مقام نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ اُن دنوں الحاج ملک الشہباز کی سماجی خدمات کا بڑا چرچا تھا۔ اُس شخص نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر سعودی عرب کا دورہ کیا اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ یہ شخص زیادہ تر میلکم ایکس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ میلکم ایکس اسلامی سرگرمیوں اور سیاہ فام باشندوں کی فلاح و بہبود میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا۔ 1965ء میں ایک لیکچر دیتے ہوئے اسے قتل کر دیا گیا۔ میلکم ایکس نے اپنی آپ بیتی لکھی تھی جو 1966ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں اس کتاب کو پڑھ کر بڑا متاثر ہوا۔ انہی دنوں میں سیاہ فام مسلمانوں کا اخبار "محمد اسپیکس" بھی باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اسلامی لٹریچر نے میری سوچوں کو بدل دیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہی سچا دین ہے۔

1968ء میں اُنیس برس کا ہو چکا تھا۔ اسلام میرے اندر تبدیلی لا چکا تھا۔ "ایک دن جو فرینینڈ لیوس ایلسن ڈور گھر سے نکلا تو اسلام قبول کر کے عبدالکریم کے نام سے گھر لوٹا"۔ میں نے اپنا اسلامی نام "کریم عبدالجبار" پسند کیا۔ میرے اسلام قبول کرنے کی خبر سن کر لوگوں نے کہا کہ تم نے اسلام قبول کر کے باسکٹ بال میں اپنا مستقبل تاریک کر لیا ہے اب تم باسکٹ بال میں شہرت حاصل نہیں کر سکو گے، مگر میں نے ان خدشوں کو غلط ثابت کیا اور باسکٹ بال کا عظیم کھلاڑی بن گیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میرے روّیے میں نرمی اور شائستگی آگئی۔ میں نے قُرآن کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے عربی زبان سیکھی اور اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے سعودی عرب اور لیبیا کا دورہ کیا۔ میں نے بائیبل کو بھی پڑھا ہے مگر میں سمجھتا اور یقین رکھتا ہوں کہ قُرآن ہی اللہ کا آخری کلام اور اسلام سچا دین ہے۔ امریکہ میں زیادہ تر سیاہ فام لوگ سیاسی وجوہ کی بنیاد پر اسلام قبول کرتے ہیں مگر میں نے اسلام اس لئے قبول کیا کہ اسلامی تعلیمات میری رُوح میں اُتر گئی تھیں۔ قُرآن وہ کتاب ہے کہ جس میں اسلام اور مسلمانوں کے علاوہ یہودیت اور عیسائیت کا بھی تفصیل سے ذکر موجود ہے اور رسُول اللہ ﷺ اور اُن سے پہلے آنے والے تمام انبیاء کرام کا ذکر موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان وہ ہے جو قُرآن، محمد ﷺ کے علاوہ تمام انبیائے کرام، تمام الہامی کتابوں، فرشتوں اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہو۔ جبکہ دوسرے مذاہب میں ایسا نہیں ہے۔ اسی لئے تو اپنی طرف آنیوالے ہر کسی کو اسلام اپنی وسعتوں میں سمو لیتا ہے۔ اسلام نے مجھے ایک اچھا انسان اور باسکٹ بال کا عظیم

کھلاڑی بنا دیا۔

کریم عبد الجبار کو باسکٹ بال سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ٹیم نے اُنکی شراکت سے متواتر 71 مقابلے جیتے۔ یہ سب اُنکی کھیل میں دلچسپی اور سات فٹ دو انچ قد کی وجہ سے ممکن ہوا۔ کریم عبد الجبار نے 1969ء سے لیکر 1989ء "لاس اینجلز لیکرز اور مِلواکی بکز" کی نمائندگی کی، دونوں ٹیموں نے کریم عبد الجبار کی قیادت میں چھ چھ مرتبہ نیشنل باسکٹ بال چمپئن شپ جیتی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے کوچنگ کا انتخاب کیا۔ باسکٹ بال ریکنگ میں وہ اپنے کیرئیر میں پوائنٹس ٹیبل پر ہمیشہ سرِ فہرست رہے۔

کریم عبد الجبار مصنف اور اداکار بھی رہ چکے ہیں۔ 1983ء میں اُنہوں نے اپنی پہلی کتاب "جینٹ سٹیپس" لکھی۔ اُس کا شمار بیسٹ سیلنگ بکس میں ہوتا ہے۔ دوسری کتاب اُنہوں نے اپنے نام "کریم" سے شائع کروائی، جو اُنکی پہلی تصنیف سے بھی زیادہ مقبول ہوئی۔ 2012ء میں اُنہیں امریکہ کا ثقافتی سفیر مقرر کیا گیا۔

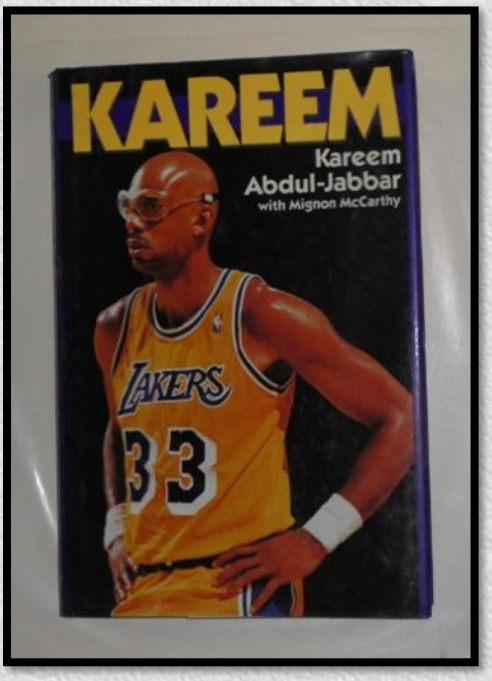

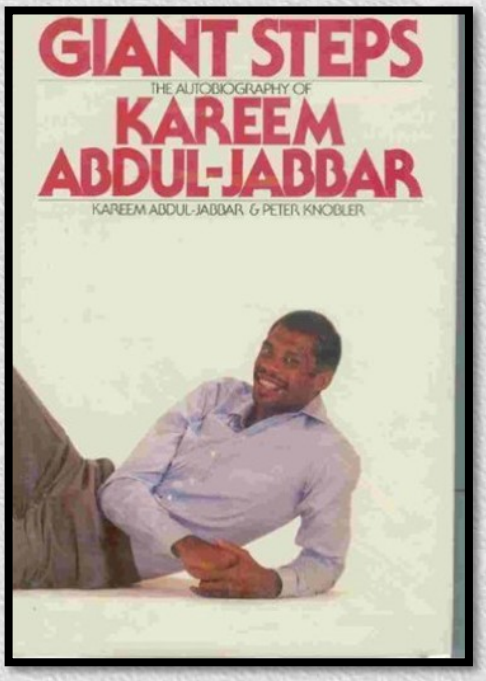

کریم عبد الجبار کی دو کتابوں کا عکس جو بیسٹ سیلنگ بُکس میں شمار ہوتی ہیں۔

ڈینس براڈلے فلپس

ڈاکٹر ابو امینیہ بلال فلپس کے قبولِ اسلام کا واقعہ

ڈینس براڈلے فلپس (ڈاکٹر ابو امینیہ بلال) 6 جنوری 1946ء میں جمیکا کے ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی اُنکے خاندان نے نقل مکانی کر کے کینیڈا میں سکونت اختیار کر لی، اس لئے انہوں نے اپنی تعلیم کینیڈا میں حاصل کی۔ انہوں نے 1972ء میں اسلام قبول کیا۔ وہ اپنے قبول اسلام کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں۔

میرا تعلق ایک عیسائی گھرانے سے تھا اور میرے والدین ٹیچر تھے۔ اور میرے دادا بائیبل کے اسکالر تھے۔ میں نے اپنی تعلیم بائیو کیمسٹری گریجوایشن کے ساتھ مکمل کی۔ زمانۂ طالبِعلمی میں امریکہ میں سیاہ فام باشندوں کیساتھ نسلی امتیاز عام تھا اس لئے میں کیمونزم نظام کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کیمونزم ہی تمام مسائل کا حل ہے۔ میں نے مختلف طلبہ تنظیموں میں شامل ہو کر سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ کیمونزم میں دلچسپی کے باعث میں نے چین کا دورہ بھی کیا۔ اِس طرح دورانِ قیام مجھے چین میں کیمونزم معاشرے کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ کینیڈا واپسی پر میں نے کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اپنے رہنماؤں کے قریب رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ زندگی میں نظم و ضبط سے عاری ہیں۔ اور انہی کے ساتھ رہ کر مجھے

سگریٹ نوشی کی لت پڑ گئی۔ میں چین سے گوریلا جنگ کی تربیت لینا چاہتا تھا مگر انہوں نے میری چین اسموکنگ کی وجہ سے مشن میں بھرتی سے انکار کر دیا۔ اب مجھے کیمونزم سے شدید نفرت ہونے لگی کیونکہ میں اُن کی وجہ سے سگریٹ نوشی کی بری لت میں پڑ گیا تھا۔

میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ میں سکون اور سچائی کو پانا چاہتا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں میری ایک ہم جماعت لڑکی نے اسلام قبول کر لیا۔ اُس لڑکی کا بھائی پہلے ہی مسلمان ہو چکا تھا۔ میں نے اُن سے کچھ اسلامی لٹریچر لے کر اُس کا مطالعہ کیا مگر میں اس سے زیادہ متاثر نہ ہو سکا۔ پھر میں نے مولانا مودودی اور سید محمد قطب کی کتاب:

Towards Understanding Islam By Syed Maulana Moudoodi

Islam: The Misunderstood Religion by Syed Muhammad Qutab

کا مطالعہ کیا تو میری زندگی بدل گئی۔ سیّد محمد قطب نے اپنی کتاب میں کیمونزم، سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ میں اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظریہ سے متفق ہو چکا تھا اور میں جان گیا تھا کہ یہی وہ نظام ہے کہ جس کے ذریعے مغربی معاشرے میں معاشی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو میری روح ابھی اسلام کی لذت سے ناآشنا تھی۔

ایک رات میں سویا ہوا تھا کہ میں خواب میں دیکھا کہ میں بیڈ پر سویا ہوا ہوں اور میرے دوست میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچانک میری سانس اُکھڑنے لگی اور میں مدد کیلئے چلانے لگا مگر میرا کوئی دوست میرے قریب نہیں آیا۔ پھر میرا دم گھُٹنے لگا تو میں ایک زوردار چیخ مارتے ہوئے بیدار ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ مشکل وقت اللہ ہی وہ ذات ہے جو انسان کو مشکل سے نکال سکتی ہے۔ اللہ ہی نے میری سانسیں مجھے لوٹائی ہیں۔ اس خواب سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسلامی تعلیمات میری روح میں سما گئی ہیں۔ میں اب اسلام میں دلچسپی لینے لگا۔ دورانِ مطالعہ میں نے یورپی سامراج سے افریقی ممالک کی آزادی میں اسلام کے کردار کے متعلق بھی پڑھا۔ اب اسلام دن بدن میری روح پر غالب ہوتا جارہا تھا۔

فروری 1972ء میں نے اسلامی تعلیمات سے مغلوب ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد میں نے مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب سے اصولِ فقہ میں ڈگری حاصل کی۔ 1985ء میں ریاض یونیورسٹی سعودی عرب سے میں نے

ایم اے اسلامیات کیا، اور پھر 1994ء میں اسلامیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اب میری زندگی کا مقصد اسلامی تعلیمات کا فروغ تھا۔ اپنے مشن کی تکمیل کیلئے میں دس برس تک ریاض کے مختلف اسکولوں میں اسلام اور عربی کی تعلیم سے وابستہ رہا۔

1994ء میں ڈاکٹر ابو امینیہ بلال نے دبئی میں پہلے اسلامک انفارمیشن سینٹر کی بنیاد رکھی۔ آپ پریسٹن یونیورسٹی عجمان متحدہ عرب امارات میں عربی اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کے سربراہ رہے ہیں۔ قطر گیسٹ سینٹر دوہا قطر میں ایجوکیشن ڈائریکٹر، ریاض میں انگلش میڈیم اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کے بانی، سوڈان میں دعوتِ اسلامی کلچر (انگلش سیکشن) کالج کے بانی، پریسٹن انٹرنیشنل کالج چنئی (مدراس) انڈیا کے بانی و سربراہ اور دوہا قطر میں اسلامی علوم اکیڈمی کے بانی اور ڈین بھی رہے۔ سب سے بڑا اعزاز یہ کہ اُردن کے اشاعتی ادارے نے آپ کا نام "دنیا میں سب سے زیادہ بااثر پانچ سو مسلمان" کی لسٹ میں درج کیا۔ آپ کا ایک اور کارنامہ اسلامی آن لائن یونیورسٹی کا قیام ہے۔ جس میں 2013ء کے آخر تک طلباء کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد تھی۔

آج کل آپ ابوہریرہ سینٹر نارتھ یارک انٹاریو کینیڈا میں امام اور خطیب کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ڈاکٹر ابو امینیہ بلال ابوہریرہ سینٹر میں ہفتہ وار پانچ یونیورسٹی لیول فری کلاسز اور ہفتہ میں دو دن مسلمان خاندانوں کو قانونی اور دینی مشورے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ابو امینیہ بلال کہتے ہیں:

میں کئی دہائیوں سے دینِ اسلام کی تبلیغ میں بھی مصروف ہوں۔ خلیج کی پہلی جنگ کے دوران مجھے امریکی فوجیوں کیساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔امریکی فوجی اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار تھے۔امریکہ میں انہیں بتایا گیا تھا کہ کوئی بھی غیر مسلم مسجد کے اندر دس قدم سے آگے نہیں جاسکتا۔پھر میں نے انہیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا اور انہیں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مختلف مساجد میں لے گیا۔وہ لوگ مسجد کی سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔سعودی عرب میں برقعہ نقاب اور حجاب ان کیلئے باعثِ حیرت تھے۔سعودی عرب میں دورانِ سفر وہ صحراء میں بدوؤں کی مہمان نوازی سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ جنہوں نے کھجوروں اور دودھ سے انکی خاطر مدارات کی۔ان کا کہنا تھا کہ وہ کئی دہائیوں سے جاپان اور کوریا میں بھی تعینات ہیں لیکن ہم نے وہاں عوام کی ایسی مہمان نوازی نہیں دیکھی۔اس کے بعد میں امریکہ آگیا اور امریکی محکمہ دفاع میں اسلامی شعبہ قائم کیا۔میں نے اُن فوجیوں سے اپنا رابطہ نہیں توڑا۔اور امریکی فوجیوں میں اسلامی تبلیغ جاری رکھی۔یہ میرے رب کا کرم تھا کہ سعودی عرب میں تعیناتی کے دوران میری تبلیغ اور سعودی معاشرے کی اقدار سے متاثر ہو کر تین

ہزار امریکی فوجیوں نے اسلام قبول کیا۔ اور اب یہ فوجی امریکی فوج میں اسلامی تبلیغ میں مصروف ہیں۔

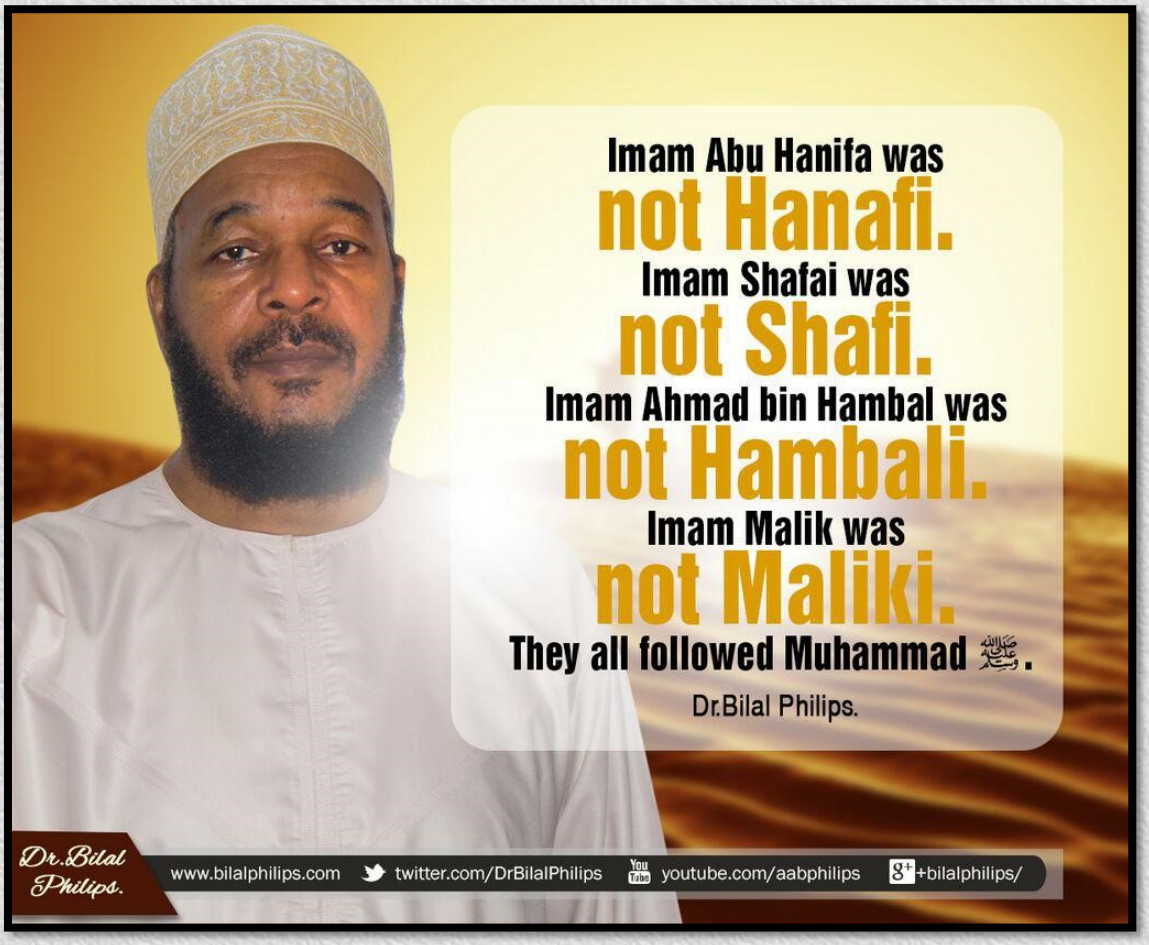

ڈاکٹر ابو امینیہ بلال کی بحثیت اسکالر اسلام کیلئے بڑی خدمات ہیں۔ اُن کا کہنا ہے: امام ابو حنیفہ حنفی نہیں تھے، امام شافعی بھی شافعی نہیں تھے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی کبھی اپنے حنبلی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور امام مالک بھی مالکی نہیں کہلاتے تھے، یہ سب تو محمد ﷺ کی پیروی کرتے تھے۔ آج کے مسلمانوں نے نہ جانے کیوں چار فقہ بنا کر اُن کی پیروی شروع کر دی ہے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر مسلمان محمدی ﷺ کیوں نہیں بن جاتے؟

ڈاکٹر ابو امینیہ بلال کہتے ہیں: میں بڑے یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ سعودی عرب ہی واحد اسلامی ملک ہے کہ جس کی معاشرتی اقدار مغرب والوں پر اسلامی دنیا کا مثبت اثر ڈال سکتا ہے۔ سعودی عرب کی معاشرتی اقدار کا مقابلہ مغربی اقوام نہیں کر سکتیں۔ امریکہ کے بیس لاکھ شہری گرم سرد موسم میں رات سڑکوں پر گذارتے ہیں۔ لیکن سعودی عرب میں آپ کو ایک شہری بھی ایسا نہیں ملے گا۔

ڈاکٹر گیری ملر

کینیڈین ریاضی دان کا قبولِ اسلام

کنیڈین ریاضی دان ڈاکٹر گیری ملر جس نے قُرآن کو چیلنج کیا، اور پھر اسلام کے مطالعہ سے اُن پر اسلام کی سچائی واضح ہو گئی اور اُنہوں نے 1978ء میں اسلام قبول کر لیا۔ الحمد وللہ آج عبد الاحد عُمر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿الشوریٰ۔ 13﴾

اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ میں برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اُس کی طرف رجُوع کرے، اُسے اپنے راستے پر چلا دیتا ہے۔

عبد الاحد عُمر (ڈاکٹر گیری ملر) ایک کینیڈین ریاضی دان ہیں اور 1977 میں ٹورنٹو یونیورسٹی میں ریاضی اور منطق کے لیکچرار تھے۔ اسلام لانے سے قبل وہ ریاضی دان ہونے کیساتھ کینیڈا میں ایک سرگرم عیسائی مبلغ بھی تھے۔ گیری ملر کو ریاضی بہت

پسند ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ریاضی کے ذریعے کسی بھی چیز کا منطقی یا غیر منطقی ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ عیسائیت کی عظیم خدمت کرنے کے لئے قرآنِ مجید کی سائنسی اور تاریخی غلطیوں کو دنیا کے سامنے لائیں گے، اور عیسائی مبلغین اِن غلطیوں کو مسلمانوں کے سامنے لا کر اُنہیں عیسایئت کی جانب راغب کر سکیں گے۔

ایک دن وہ قرآن لے کر بیٹھا اور اُس نے پوری کوشش کی کہ قرآن پاک میں کوئی غلطی یا تضاد ڈھونڈ نکالے۔ وہ کامیاب نہ ہو سکا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ قرآن اپنے پڑھنے والے کو چیلنج دیتا ہے کہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن من جانب اللہ نہیں ہے تو اس میں کوئی خامی یا تضاد ڈھونڈ کر دکھا دیں۔ اس کا خیال تھا کہ قرآن چودہ سو سال پرانی کتاب ہے اور صحرا اور پرانی داستانوں کے بارے میں بات کرتی ہو گی۔ مگر جب اُس نے قُرآنِ کریم کا مطالعہ کیا تو وہ حیران ہو کر رہ گیا۔

قُرآنِ کریم کے مطالعہ سے اُسے معلوم ہوا کہ یہ کتاب دنیا کی ہر کتاب سے منفرد ہے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ قُرآن میں محمد ﷺ کی زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر ہو گا۔ مثلاً اس میں تبلیغِ اسلام میں پیش آنیوالی مشکلات اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کا ذکر ہو گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرآن کریم میں حضرت مریم علیہا السلام کے نام سے ایک پوری سورۂ موجود ہے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام سے کوئی سورۂ منسوب نہیں ہے۔ اُسے یہ بھی علم ہوا کہ قُرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا نام پچیس مرتبہ آیا ہے جبکہ نبیٔ کریم ﷺ کا نام صرف چار بار آیا ہے۔ گیری ملر کی قُرآن میں غلطی یا تضاد ڈھونڈنے کی کوشش مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔

قُرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہوئے جب اُس نے سورۂ النساءٔ کی یہ آیت پڑھی تو وہ دنگ ہو کر رہ گیا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿النسأ۔82﴾

کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر وہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو وہ اُس میں اختلاف پاتے۔

ڈاکٹر گیری ملر کا کہنا ہے کہ کسی بھی نظریے میں تضاد اُسے باطل کر دیتا ہے لیکن قُرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ جس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بلکہ قُرآن خود لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ قرآن میں اختلاف یا تضاد ڈھونڈیں اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اِس میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ ڈاکٹر گیری ملر کہتے ہیں کہ دنیا کے کسی رائٹر (مصنف) میں یہ ہمت نہیں کہ وہ ایسا چیلنج کر سکے۔

انہوں نے کہا کہ:

"قُرآن مجید کا لکھنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں اور اس کے الہامی ہونے میں کوئی شک نہیں"

انہوں نے اس بارے میں سورۃ البقرہ کا حوالہ دیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿البقرۃ۔23﴾

اور اگر تم کو اس (کتاب) میں، جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ عربی) پر نازل فرمائی ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورۃ تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلالو اگر تم سچے ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ سورہ الانبیاء کی تیسویں آیت انکشاف کرتی ہے کہ

''أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴿الانبیأ۔30﴾''

''کیا کافر نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انہیں جُدا کر دیا۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہے کہ ہم نے تمام زندہ اشیاء کو پانی سے پیدا کیا؟''

ڈاکٹر گیری ملر کہتے ہیں کہ اِس آیت کی حقیقت ایک سائنسی تحقیق کے نتیجے میں سامنے آئی ہے جسے 1973ء میں نوبل انعام دیا گیا تھا۔

یہ ایک بڑے دھماکے کے متعلق ہے جس نے زمین اور آسمان کو جُدا کر دیا۔ اُسی دھماکے سے کائنات وجود میں آئی۔

اُن کا کہنا ہے کہ قران کہتا ہے کہ شیطان قرآن کے قریب نہیں آسکتا۔ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کریں۔

ڈاکٹر گیری ملر چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جدید سائنسی کے علوم کے ماہر ہیں اس لئے وہ ان قُرآنی انکشافات کے متعلق نہایت اعتماد سے بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۃ اللہب قُرآن کی سچائی ایک بڑا ثبوت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ابو لہب جو محمد ﷺ کا چچا تھا۔ اُس کو حضور ﷺ سے عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد قرآن، اسلام اور حضور ﷺ کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد ﷺ کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ جہاں بھی آپ ﷺ جاتے تھے، وہ پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ ﷺ کی ہر

بات کو جھٹلاتا۔ اگر آپ ﷺ کہتے کہ یہ چیز سفید ہے تو وہ جھٹ بول اٹھتا، نہیں یہ چیز کالی ہے۔ اگر آپ ﷺ کہتے کہ دن ہے تو وہ کہتا، نہیں رات ہے۔ قرآن میں ابو لہب کا ذکر بھی آیا ہے کہ:

"وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلنا اس کا مقدر ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گا، کافر ہی رہے گا۔"

گیری ملر لکھتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابو لہب دس سال زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ وہ مسلمانوں سے کہتا دوستو! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، مجھے مسلمان بنا لو اور جب وہ مسلمان بنا لیتے تو کہتا لو بھئی! تمہارا قرآن جھوٹا ثابت ہو گیا۔ اب بولو۔ لیکن ابو لہب نے ایسا نہیں کیا حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے حضور ﷺ کو جھٹلائے۔ مگر ایسا ہوا نہیں، کیونکہ اللہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ اور قُرآن کی یہ آیت اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے اور قُرآن کے الہامی کتاب ہونے کی تصدیق کرتی ہے قُرآن کا ہر لفظ خواہ ماضی سے متعلق ہو خواہ مستقبل سے، سچائی پر مبنی ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿البقرہ۔ 284﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

گیری ملر لکھتا ہے کہ:

قوموں کی حیثیت سے انسانی رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ بحیثیت قوم، یہودیوں کی نسبت عیسائی مسلمانوں سے بہتر سلوک روا رکھیں گے۔ لہٰذا یہودیوں کے لیے قرآن کو جھٹلانا بڑا آسان کام تھا۔ یہودی مسلمانوں سے میل جول بڑھاتے۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ انھیں اپناتے۔۔۔ پھر کہتے مسلمانو! تمہارا قرآن غلط ہے۔ چونکہ ہم مسلمانوں سے عیسائیوں کی نسبت بہتر تعلقات کے حامل ہیں لیکن یہودیوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور لگتا ہے کہ مستقبل میں بھی ایسا نہیں کریں گے۔

گیری ملر نے تو بڑی رواداری سے بات کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کا مسلمانوں سے جو رویہ ہے وہ قرآن کو جھٹلانے کی بجائے اس کے دعوے کو شدت سے تقویت دیتا ہے۔ قرآن پڑھنے سے پہلے میں حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ

ہر فرقہ اپنے نظریات کے جواز کے لیے قرآن کا حوالہ دیتا ہے حالانکہ اُن کے نظریات مختلف یا متضاد ہوتے ہیں۔ عقل وشعور کو ماننے والے بھی قرآن کا حوالہ دیتے ہیں۔ جذبے اور وجدان کو ماننے والے بھی قرآن کا حوالہ دیتے ہیں۔ تنگ خیال کٹر مسلمان بھی اپنے مسلک کا جواز قرآن سے اخذ کرتے ہیں۔ پرانی بات ہے، اُن دنوں میں سرکاری میڈیا کے ایک محکمے میں کام کرتا تھا۔ اوپر سے حکم آتا کہ قرآن سے فلاں بات کے جواز کے لیے آیت تلاش کرو اور حکومت کے فلاں اقدام کے حق میں سکرپٹ لکھ کر اسے نشر کرو۔ حکم موصول ہونے پر ہم مولوی صاحب کو بلا بھیجتے جو میڈیا کے سٹاف پر تھے ۔ مولوی صاحب بغیر کسی تردد کے آیت ڈھونڈ کر مجھے اس کا ترجمہ لکھا دیتے اور میں سکرپٹ لکھ دیتا۔ ان دنوں مجھے کبھی احساس نہ ہوا تھا کہ ہم قرآن کو استعمال کر رہے ہیں اور لاجک کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

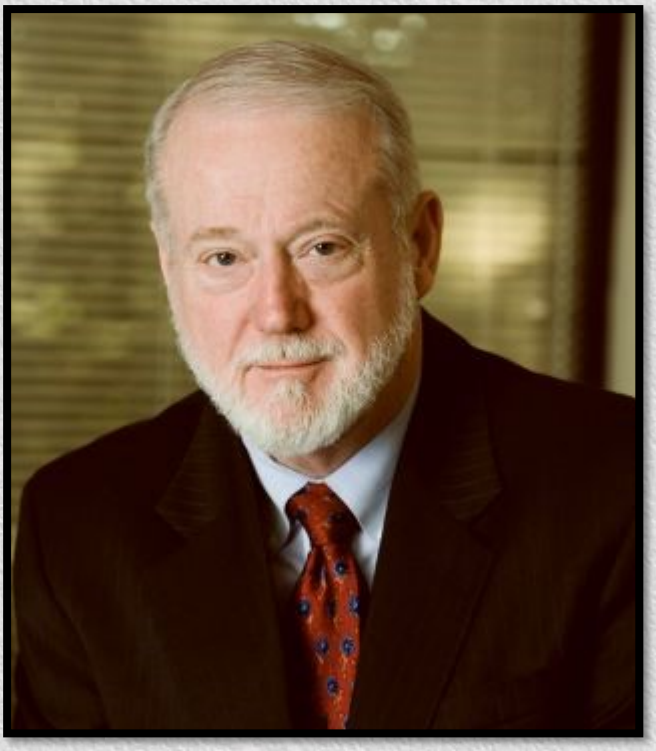

گیری ملر کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کے موجودہ عہد (زمانہ) کا ذکر کرتا ہے جو قرآن کے متعلق ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ باوجود اتنے زیادہ مطالعہ، نظریات اور قرآنی نزول کی صداقت پر حملوں کی کوشش اور بہت سے بہانے اور حجتیں جن کو منطقی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ گرجاگھر (چرچ) کو اپنے آپ میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ ان نظریات کو اپنا سکے اور ابھی تک اس نے مسلمانوں کے نظریہ کی سچائی اور حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ قرآن مجید میں کوئی شک نہیں اور یہ آخری آسمانی کتاب ہے۔ حقیقت میں پروفیسر گیری ملر اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنے اور اور صحیح راستہ چننے میں کافی حد تک صاف گو اور ایماندار تھے۔ اللہ

اسے اور اس جیسے ان تمام لوگوں کو (جنہوں نے حق کو تلاش کیا اور اپنے تعصب کو اجازت نہیں دی کہ انہیں حق تک پہنچنے سے دور رکھے) مزید ہدایت نصیب فرمائے اور حق کی روشن شاہراہ پر چل کر اپنی عاقبت سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

1977ء میں پروفیسر گیری ملر نے مسلمان اسکالر جناب احمد دیداتؒ سے ایک بہت مشہور مکالمہ، بحث و مباحثہ کیا اس کی منطق صاف تھی اور اس کا عذر (تائید) ایسے دکھائی دیتا تھا کہ جیسے وہ سچائی تک بغیر کسی تعصب کے پہنچنا چاہتا تھا بہت سے لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ اسلام قبول کر کے مسلمان ہو جائے۔

1978ء میں پروفیسر گیری ملر نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے لئے عبد الاحد عُمر نام پسند کیا۔ اس نے کچھ عرصہ سعودی عرب تیل اور معدنیات کی یورنیورسٹی میں کام کیا اور اپنی زندگی کو "دعویٰ ٹیلی ویژن اور لیکچرز" کے لئے وقف کر دیا۔

مائیکل وولف

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

"اسلام دراصل اللہ کے اُس دین کی تکمیل ہے جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السّلام کو زمین پر بھیجنے سے ہوا"

یہ مائیکل وولف کے الفاظ ہیں، جنہوں نے 80ء کی دہائی میں اسلام قبول کیا۔ اسلام اللہ کا سچا اور خالص دین ہے۔ جس کا اِرتقاٗ اور حفاظت رب العزت نے خود اپنے ذمے لی ہے۔ مائیکل وولف کی کہانی کچھ یوں ہے۔

مائیکل وولف ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جو دو مذاہب کا امتزاج تھا۔ اُس کا باپ جیوش (یہودی) تھی اور ماں عیسائی تھی۔ جب مذہب کے بارے میں مائیکل وولف کے ذہن میں کوئی سوال اُٹھتا تھا تو اُسے دو مذاہب کے الگ الگ نظریات سے ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ ہر ایک کا کہنا ہے کہ وہ اللہ کی محبوب قوم ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مائیکل وولف نے ایک مصنف اور فلم میکر کا پیشہ اپنایا۔ مائیکل کہتے ہیں کہ مجھے یہ پیشہ اپنائے ہوئے پچیس سال ہو گئے تھے مگر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ میری منزل نہیں ہے۔ میں فکر و نظر کے نئے انداز کی تلاش میں تھا۔ نسل پرستی سے مجھے بہت زیادہ الجھن ہوتی تھی۔

مُجھے اپنے پیشے کے اعتبار سے دور نزدیک کی سیاحت سے واسطہ رہتا تھا۔ اسی غرض سے میں تین سال تک افریقہ میں رہا۔

افریقہ میں مجھے کالے لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا پڑا۔ ان قبائل میں افریقی، عربی اور یورپین (مسلم) لوگ بھی شامل تھے۔ مجھے یہاں نیا تجربہ ہوا کہ ان لوگوں میں یورپ کی طرح طبقاتی تقسیم نہیں تھی۔ یہ لوگ ہر آنیوالے کا استقبال انتہائی گرمجوشی سے کرتے تھے اور اُس کی شخصیت کا اندازہ اُس کی خوبیوں اور خامیوں سے لگاتے تھے۔ مجھے ان لوگوں کی یہ بات بہت پسند آئی۔ جبکہ یورپ اور امریکہ والے لوگوں کو نسل کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں۔ امریکی لیڈر میلکم ایکس کو بھی اپنی قوم سے امریکیوں کے امتیازی سلوک کا حل اسلام میں ہی نظر آیا۔ میں اِس مادی تہذیب کی بجائے روحانیت کا راستہ ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ مگر میرے لئے تمام روایتی دروازے بند تھے کیونکہ میرے والدین دونوں مختلف مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور دونوں خود کو اللہ کی پسندیدہ قوم قرار دیتے تھے۔ مجھے دونوں کی دلیلوں سے اختلاف تھا۔

میں اپنی باقی ماندہ زندگی آرام اور روحانی سکون سے گذارنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں ابھی تک افریقی ملک مراکش کی یادیں نقش تھیں۔ 1981ء اور 1985ء میں مراکش کے دوروں میں مجھے محسوس ہوا کہ یہاں کے لوگ ہم سے بہتر اور متوازن زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ سب وہاں براعظم افریقہ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہاں رائج سسٹم کی وجہ سے تھا۔ اور وہ سسٹم اسلام تھا۔ جس میں چھوٹے بڑے کی تفریق نہیں تھی کسی قسم کی دوریاں نہیں تھیں جبکہ ہمارے اور پادریوں، راہبوں کے درمیان میں لفظ مقدس کی ایک وسیع خلیج حائل تھی اور پھر عیسائیت میں خوشیوں کا محور صرف پادریوں ہی کے گرد گھومتا تھا۔

میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا تو بہت جلد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس میں میرے تمام سوالوں کے جواب ہیں اور مجھے اسی کی تلاش تھی۔ دورانِ سفر مجھے معلوم ہوا کہ 44 ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہاں لوگ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ تقریباً اتنے ہی لوگ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں اقلیتی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے بعد معاشی حالات کی وجہ سے تیس برسوں میں اسلام مغربی یورپ کے بڑے مذاہب میں شامل ہو گیا ہے۔ صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے کہ جس کے ماننے والوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

تاریخی اعتبار سے مسلمان اسلام کو آخری دین سمجھتے ہیں۔ اسلام کے پیروکاروں کی اچھائی یہ ہے کہ وہ رسُول اللہ ﷺ کے علاوہ حضرت آدم علیہ السّلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام نبیوں کو محترم مانتے ہیں۔ میری نظر میں اسلام دراصل

اللہ کے دین کی تکمیل ہے جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السّلام کو زمین پر بھیجے جانے سے ہوا تھا۔

مائیکل وولف کہتے ہیں کہ میں نے دس سال تک اسلام کا باریک بینی سے بغور مطالعہ کیا اور یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ دراصل اسلام ہی میری منزل ہے۔ میں نے اپنے دل و دماغ سے گرین سگنل ملتے ہی حتمی فیصلہ کیا اور کیلیفورنیا کی مسجد میں جا کر اسلام قبول کر لیا۔ اور اسلامی نام عبد الحمید پسند کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد میں نے پہلی بار روزے رکھے اور پھر میں نے حج کی سعادت حاصل کی۔ مجھے مراکش سے بہت محبت تھی کیونکہ یہیں سے اللہ نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا تھا۔

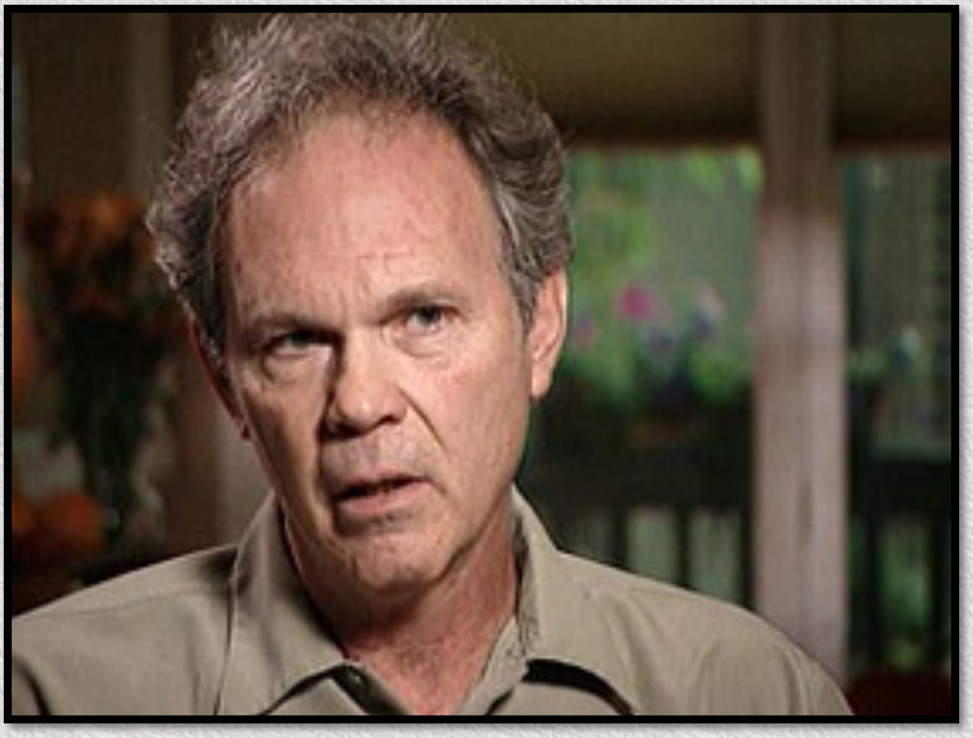

عبد الحمید وولف اسلام قبول کرنے کے بعد ایک طویل عرصے تک مراکش میں رہے۔ مراکش میں قیام کے دوران اُنکا زیادہ عرصہ اسلام کی تحقیقی سرگرمیوں میں گذرا۔ انہوں نے اپنا پہلا رمضان بھی مراکش میں گذارا اور پھر شوقِ سفر میں حج کیلئے روانہ ہوگئے۔ اپنے حج کے سفر سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ایک کتاب "الحج" میں بیان کیا۔ مائیکل وولف امریکہ کے مشہور شاعر اور اور ناول نگار ہیں۔ کتاب الحج کی تکمیل کو سات سال لگے۔ مائیکل وولف کا کہنا ہے کہ انہوں نے 1981ء اور 1985ء میں دوبار مراکش کا سفر کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسلم دنیا کے ان دو سفروں سے میری زندگی کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ میں اسلام کا جس قدر مطالعہ کرتا گیا اُسی قدر کشش بڑھتی گئی۔ "الحج" عبد الحمید وولف کا سفر نامہ بھی ہے اور سوانح عمری بھی۔ یہ کتاب پہلی بار 1994ء میں برطانیہ میں شائع ہوئی۔

کتاب الحج میں عبد الحمید وولف لکھتے ہیں:

میرے دادا یہودی تھے وہ 1890ء میں بیلاروس سے ہجرت کر کے امریکی ریاست اوہائیو میں آباد ہو گئے تھے۔ میرے والد نے قدامت پرست یہودی تھے اُنہوں نے یہودیت ترک کر کے ایک عیسائی عورت سے شادی کر لی تھی اور وہ سنسنائی میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔

عبد الحمید وولف اپنی تصنیف الحج کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

میں واشنگٹن میں سعودی سفارتکار شہزادہ بن فیصل شیخ خلیل اور سین ہوزے اسلامی مرکز کے پیش امام ڈاکٹر خالد صدیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اسلام کے بارے میں رہنمائی کی، مُجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ انِ لوگوں نے ہی مجھے اسلام کا راستہ دکھایا ہے۔ اپنی علمی استعداد کے مطابق میں نے اس کتاب میں دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک ایسے مذہب پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ جسے سب سے کم تر سمجھا گیا ہے۔ جس نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی روح میں اُتر گیا۔

عبدالحمید وولف فریضۂ حج ادا کرتے ہوئے

عبدالحمید وولف نے اسلام قبول ہی نہیں کیا بلکہ اپنی ذات کو اُس میں گم کر دیا۔ اسلام سے اُنہیں اس قدر محبت اور لگاؤ ہے کہ اُنہوں نے اسلام کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔

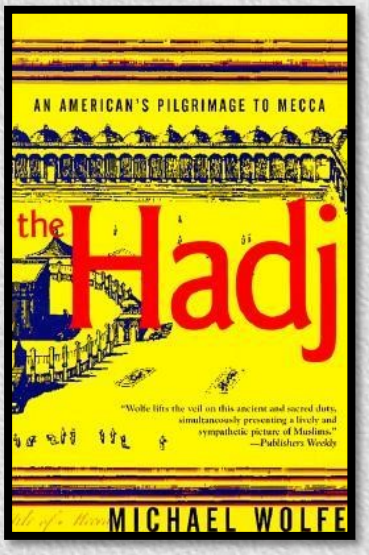

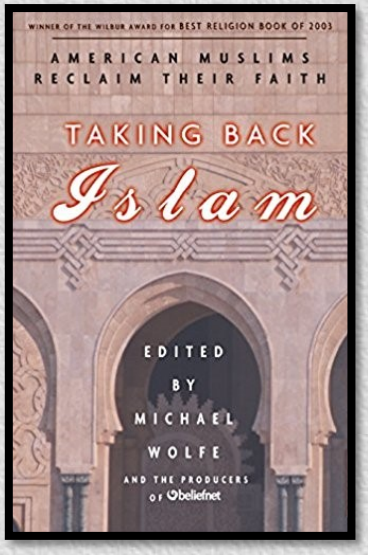

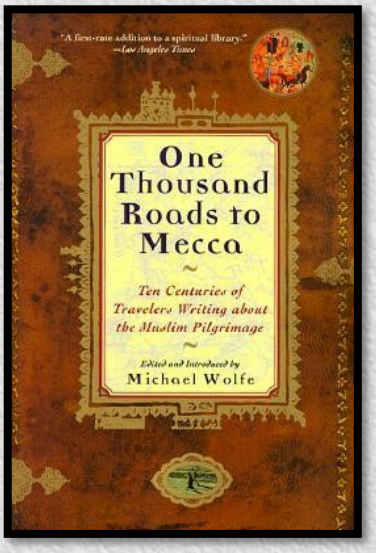

اللہ تعالیٰ اسلام میں ان کی دلچسپی برقرار رکھے اور ایمان میں استقامت عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر لارنس براؤن

ایک مُعجزے نے مُجھے حق کا راستہ دکھا دیا

کوئی سبق آموز واقعہ ہی انسان کو سچائی کے راستے پر لاتا ہے۔ یہ الفاظ ڈاکٹر لارنس براؤن کے ہیں۔ یہ الفاظ انہوں نے اُس وقت کہے جب لوگ اُن سے اسلام لانے کے بارے میں پوچھتے تھے۔ انہوں نے اپنی کہانی اِن الفاظ میں بیان کی۔

میں نے ایک ملحد گھرانے میں جنم لیا میرے گھر کا کوئی فرد بھی خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی تو مجھے امریکن ائیر فورس میں ملازمت مل گئی۔ مجھے ایک لڑکی پسند آئی تو میں نے اُس سے شادی کر لی۔ میری بیوی بھی میری طرح سیکولر خیالات رکھتی تھی۔

1990ء میں سردی کا موسم تھا کہ میری دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ پیدائش کے فوراً بعد ڈاکٹروں نے بچی کو آئی سی یو میں داخل کر لیا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے سے مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ پیدائش کے وقت میری

بیٹی کی شریانیں سُکڑی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے دل کو جسم میں خون کی روانی بر قرار رکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ یہ سن کر میں کانپ گیا کیونکہ نومولود بچی کی جان بچانے کیلئے سینے کی سرجری بہت ضروری تھی۔ اب بچی کے زندہ بچنے کی امید بہت کم تھی۔ ہسپتال میں فوری طور پر ہارٹ سرجن کو طلب کر لیا گیا اور ہارٹ سرجن کے پہنچتے ہی مجھے آئی سی یو سے باہر جانے کی ہدایت کی گئی۔

آئی سی یو سے باہر آیا تو مجھے اپنی بے بسی پر رونا آگیا اور میں روتے روتے ہسپتال میں عبادت کیلئے مخصوص کمرے میں پہنچا۔ آج پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ کوئی تو ہے جو اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے۔ میرے دل نے خدا کو پہچان لیا تھا۔ میں نے سچے دل سے خدا کی عبادت کی اور اپنی بچی کی صحت کیلئے دُعا کی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ربِ کائنات ضرور میری دُعا قبول کریگا اور میری بچی صحتیاب ہو جائیگی۔ میں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ میری بچی صحت یاب ہو گئی تو میں ہمیشہ تیری بندگی کروں گا اور کبھی نافرمانی نہیں کروں گا۔ میرے دل نے کچھ سکون محسوس ہوا تو میں عبادت کے کمرے سے نکل کر آئی سی یو کمرے کی طرف لوٹ آیا۔

آئی سی یو سے نکل کر ہارٹ سرجن نے مجھے بتایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں میری بیٹی بہت جلد صحتیاب ہو جائیگی۔ ڈاکٹر کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور خدا پر میرا یقین اور مستحکم ہو گیا۔ سرجن کی بات سچ ثابت ہوئی اور دو روز میں میری بچی کی حالت بہتر ہونے لگی یقیناً یہ میری دُعا ہی تھی کہ جس سے بچی بغیر دوا اور سرجری کے تندرست ہو گئی۔ اب وہ ایک نارمل لڑکی کی طرح زندگی گذار رہی ہے۔

ڈاکٹرز نے میری بیٹی کے صحتیاب ہونے کے متعلق مختلف توجیہات پیش کیں۔ میں جو اُس وقت ایک ملحد کی زندگی گذار رہا تھا اِسے ڈکٹروں کا کارنامہ قرار دے سکتا تھا۔ مگر میں اُس کیفیّت کو نہیں بھول پایا تھا جو مجھ پر ہسپتال کے عبادت کے کمرے میں مجھ پر طاری تھی۔ میں یہ جان گیا تھا کہ ایسے معجزے صرف خدا ہی دکھا سکتا ہے کوئی ڈاکٹر نہیں۔

ڈاکٹروں کی مشاورت سے میں وقفے وقفے سے اپنی بیٹی کے آلٹرا ساؤنڈ ٹیسٹ کرواتا رہا اور آخر کار بچی کی شریانوں میں نظامِ خون بالکل نارمل ہو گیا۔ میں نے مُشکل میں خدا کو پکارا تو اُس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میری خلوص بھری دُعا نے خدا کے ہاں

قبولیت حاصل کرلی تھی۔

میں نے اللہ سے اُسکی بندگی اختیار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں کوشش کرتا رہا مگر بے نتیجہ۔ میں نے یہودیت اور عیسائیت کے متعلق مطالعہ کیا مگر میری روح نے سچائی کی تائید نہیں کی۔ اگرچہ میں نے عیسائیت قبول نہیں کی مگر میں سچائی کے قریب تر پہنچنے کیلئے ایک کیتھولک چرچ جانے لگا۔ بائیبل کی تعلیمات سے میں مطمئن نہ ہوا تو چرچ جانا چھوڑ دیا تو مختلف مذاہب کے بارے میں گھر پر ہی مطالعہ کرنے لگا۔

دورانِ مطالعہ مجھے قُرآنِ پاک کا ترجمہ اور مارٹن لنگز کی سیرتِ نبوی ﷺ پر لکھی ہوئی کتاب "محمد" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

دورانِ تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں پڑھ چکا تھا اور میں خدا کے بارے میں ان مذاہب کے تصور سے بھی میں اچھی طرح واقف تھا۔ اسلام کی تعلیمات کے بارے میں اِس سے پہلے مجھے کچھ واقفیت نہ تھی۔ اب جو میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا تو میرے ذہن کے بند دریچے کھلنے لگے۔ یوں یوں میں قُرآن پاک اور سیرتِ رسُول ﷺ کا مطالعہ کرتا گیا اسلامی تعلیمات میری روح میں اُترتی گئیں۔ اللہ اور اُس کے رسُول نبیٔ آخر الزماں محمد ﷺ اور قُران کے آخری کتاب ہونے کا تصور مجھ پر واضع ہوتا چلا گیا اور میرے دل نے سب سچ جان لیا۔ اب سوائے قبول کرنے کے اور کوئی راہ نہ تھی اور میں نے 90 کی دہائی میں اسلام قبول کر لیا۔

میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوا تو احساس ہوا کہ: "اللہ اُن لوگوں کو ہدایت نصیب فرماتا ہے جو اِس کی تمنا رکھتے ہیں۔"

دنیا میں مجھ سے بہتر علم رکھنے والے بہت زیادہ لوگ ہونگے مگر وہ سچائی کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اُن کے دل سچائی کی طلب سے عاری ہوتے ہیں۔ سچائی کی طلب اہلیت یا ذہانت سے نہیں بلکہ اخلاص سے پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ حق کی تلاش میں مدد کے طالب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُنکی مدد فرماتے ہیں۔ جو لوگ غلط عقائد پر قائم رہنا پسند کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُنہیں اُنکے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ لوگ تمام عُمر بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ ایک پریشانی نے مجھ پر اللہ کی سچائی واضع کر دی، میں نے اللہ کو پہچانا، خلوصِ دل سے اُس کے دین پر چلنے کا عہد کیا تو اُس کی رحمت مجھے صراطِ مُستقیم پر لے آئی۔

ڈاکٹر لارنس براؤن مختلف مذاہب پر تحقیق کے علاوہ متعدد کتابیں بھی لکھ چکے ہیں:

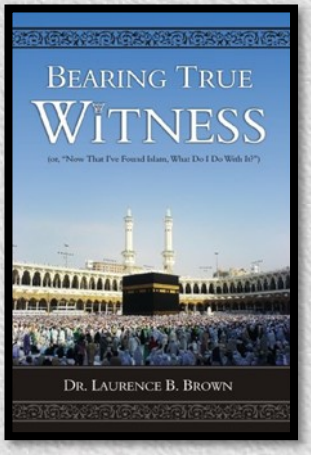

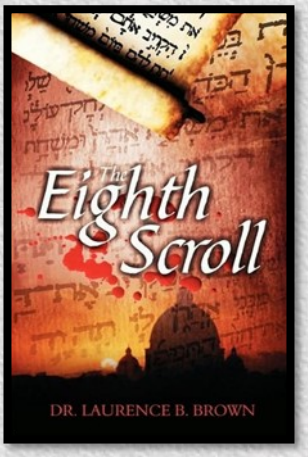

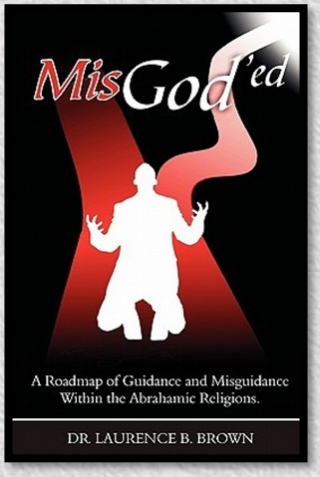

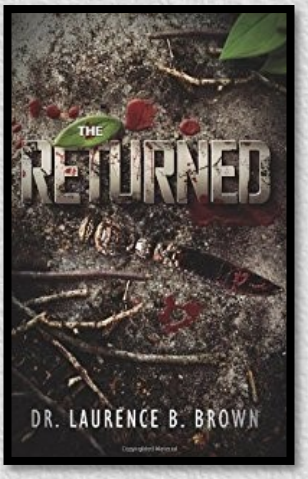

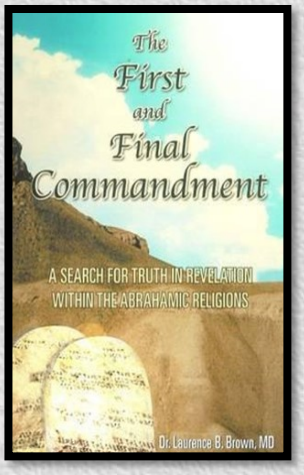

ایلن رونی

اسکاٹ لینڈ میں اسلام کی کِرن

اسلام قبول کرنے سے پہلے نہ تو کبھی میری کسی مسلمان سے دوستی رہی، نہ ہی کبھی میں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور نہ ہی کسی تبلیغی مشن نے مُجھ سے رابطہ کیا۔ مُجھے سیاحت کا شوق تھا اور اپنے شوق کیلئے اِس مرتبہ میں نے چُھٹیاں گذارنے کیلئے ترکی کا انتخاب کیا۔ سیاحت کے دوران مُجھے ترکی کے ایک گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز گاؤں میں قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مُجھے گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی جو میرے وجود میں سماتی چلی گئی۔ میرا دل اور میری روح یہ جاننے کیلئے بے چین ہو گئے کہ اذان کا مطلب کیا ہے؟ میں اُس وقت گاؤں میں ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیالات آنے لگے کہ میں پیدا ہوا پھر تعلیم حاصل کرتے کرتے جوانی کو پُہنچ گیا۔ پھر ملازمت کر کے زندگی سے لُطف اندوز ہونے لگا۔ پھر شادی کر لی اور بچے پیدا ہو گئے۔ زندگی کا کافی حصہ سیر و سیاحت میں گذار دیا۔ آخر ایک دن مر کر اِس دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا۔ میں اپنی ذات میں اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا انسان کی زندگی

کا بس یہی مقصد ہے ؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مُجھے پھر مسجد کے اسپیکر سے کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں، میں ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا مگر اتنا ہی جان سکا کہ یہ عربی زبان ہے۔اب میں ان آوازوں کا مطلب جاننے کیلئے بے چین ہونے لگا۔ پھر میرے قدم مُجھے مسجد تک لے گئے تو میں بغیر ہچکچاہٹ کے اندر چلا گیا۔

مسجد میں موجود لوگ میری جانب دیکھنے لگے کیونکہ ایک اجنبی کی طرف اُن کا متوجہ ہونا ایک فطری عمل تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اُنہیں بتایا کہ اسپیکر سے آنے والی آوازیں مُجھے یہاں تک لے آئی ہیں اور میں ان کا مطلب جاننے کیلئے بے چین ہوں؟

میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے وہاں موجود لوگوں نے بتایا: پہلے جو میں نے سُنا، وہ اذان تھی۔ اذان مسلمانوں کو نماز کیلئے مسجد میں بلانے کی دعوت ہے۔ اذان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکارا جاتا ہے کہ آؤ مومنو! اپنی اور انسانیت کی اصلاح اور فلاح کرو یعنی بھلائی کیلئے کچھ کرو۔ جب نماز ادا کی جاتی ہے تو بندہ اپنے رب کی شان بیان کرتا ہے اور پھر اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اذان کا مطلب سمجھ کر میں نے فلاح کی دعوت پر لبیک کہہ دیا۔

مسلمانوں کی بتائی ہوئی باتیں میرے دل میں اُتر گئیں۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اِن لوگوں کی طرح اللہ کے آگے سجدہ کیا کروں۔ اُنہوں نے مُجھے نماز کا طریقہ بتا دیا۔ مسجد سے باہر نکلا تو میں اسلام قبول کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

ایلن رونی کہتے ہیں کہ جب میں ترکی سے واپس اسکاٹ لینڈ آیا تو اپنے شہر اینفرنیس پہنچتے ہی ایک بُک شاپ کا رُخ کیا جہاں سے میں نے اپنے لئے قُرآنِ کریم کا ایک ایسا نسخہ ڈھونڈا جس کی آیات کا ترجمہ انگلش میں بیان کیا گیا تھا۔

میں نے قُرآن کو پڑھنا شروع کیا تو مُجھے ایک ایک کر کے میرے سوالوں کے جواب ملتے گئے۔ قُرآن نے میرے دل کے بند دریچوں کو کھول دیا اور میرے اندر تبدیلی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ میں نے قُرآن کو تین مرتبہ پڑھا اور ہر مرتبہ میرا وجود نکھرتا چلا گیا۔

میں نے نماز پڑھنا انٹرنیٹ سے سیکھا۔ میں جب انٹرنیٹ پر قُرآن سنتا تو عجیب سا روحانی سکون ملتا۔ قُرآن کی تلاوت میری رُوح کی پیاس کو بجھا دیتی تھی تلاوت سُن کر مُجھے احساس ہوتا کہ یہ دُنیا کی ہر موسیقی سے بڑھ کر لذت دیتی ہے۔ قُرآن کو سیکھنے اور اسلام کو سمجھنے میں مُجھے اٹھارہ مہینے لگے۔ اِس ڈیڑھ سال میں نے نمازِ پنجگانہ شروع کر دی اور رمضان کے روزے بھی

رکھے اور مُجھے حلال و حرام کی تمیز بھی ہو گئی۔۔ اگرچہ میں نے ابھی اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا، مگر میں گھر والوں اور خاندان سے چُھپ چُھپ کر نماز پڑھتا تھا۔ جب اللہ کے آگے جُھکتا تو رونے لگتا اور جب سجدہ کرتا تو اللہ سے دُعا کرتا کہ مُجھے صراطِ مُستقیم پر چلا۔

میرے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کو میرے گھر والوں، خاندان والوں اور دوست و احباب نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اکثر یہ کہتے تھے کہ ایلن رونی: تم بہت بدل گئے ہو اور یہ کہ تم پہلے والے ایلن رونی نہیں رہے۔ اپنے سے منسُوب لوگوں کی باتیں سُن کر میں نے سوچا کہ اب یہ بات زیادہ دیر تک چُھپی نہیں رہ سکتی اِس لئے مُجھے اب اسلام قبول کر لینا چاہیئے اور اِس کا باقاعدہ اعلان بھی کر دینا چاہیئے۔

ایک روز میں اپنے ٹاؤن کی مسجد میں گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ مسجد میں موجود نمازیوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور مُجھے گلے لگا کر مبارکباد دی۔ مسلمانوں کے سلوک سے مُجھے یقین ہو گیا کہ اسلام عالمی اخوت اور بھائی چارے کا مذہب ہے۔

برطانوی جریدے انڈی پینڈنٹ سے باتیں کرتے ایلن رونی نے بتایا: دراصل اذان اللہ کا بلاوہ تھا کہ جِس نے مجھے اسلام کی طرف بلایا اور مجھے راہِ ہدایت دکھائی۔

بیشک میں گوری چمڑی والا اسکاٹش ہوں اور برٹش پارلیمنٹ کا رُکن بھی ہوں مگر سب سے بڑھ کر میرے لئے فخر کی بات یہ ہے کہ: "الحمدوللہ میں مسلمان ہوں"

علی پولوسِن

رُوسی ممبر پارلیمنٹ کے قبولِ اسلام کی داستان

علی ویشوسلاو پولسن 26 جون 1956ء کو ماسکو روس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کر کے اُنہوں نے ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے کیمونزم فلاسفی میں پی ایچ ڈی کی۔ انہوں نے سیاسی مطالعہ (پولیٹیکل اسٹڈیز) میں ڈپلومہ بھی کیا۔ اگرچہ اُنہوں نے کیمونزم کے ماحول میں پرورش پائی مگر کیمونزم کی فکری سوچ سے کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ وہ نہ صرف اپنی علمی استعداد اور فکری سوچ کی بدولت عیسائی چرچ میں پادری رہے بلکہ روسی پارلیمنٹیرین اور بین المذاہب کمیٹی کر چیئرمین بھی رہے۔ بلاآخر اُن کی فکری سوچ انہیں اسلام کی راہ پر لے آئی۔ وہ اپنی کہانی خود ہی بیان کرتے ہیں:

میں رُوس میں پیدا ہوا۔ ثانوی تعلیم کے حصول کے بعد میں نے ماسکو یونیورسٹی سے کیمونزم فلاسفی میں پی ایچ ڈی کی اور پولیٹیکل اسٹڈیز میں ڈپلومہ کیا۔ سویت یونین (مُتحدہ روس) کے زمانے میں میں نے فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے ملازمت بھی کی مگر میری فکری سوچ کبھی بھی کیمونزم سے مطمئن نہ ہو سکی۔ میرا خیال تھا اِس میں کوئی خامی ضرور ہے، یہ ممکن ہی

نہیں کہ اِس کائنات اور دُنیا کا کوئی خالق نہ ہو۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ دُنیا میں کوئی چیز خود بخود بننا شروع ہو جائے۔ اور وہ کسی استعمال میں بھی آئے؟ یقیناً نہیں! تو پھر یہ دُنیا اور کائنات کا نظام بھی کسی کے تابع ہے۔ میں خالق کی تلاش میں عیسائیت کی جانب مائل ہو گیا اور جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ 1983ء میں اپنی محنت اور علمی قابلیت کی بنا پر روسی آرتھوڈکس چرچ کا پادری بن گیا۔

مُتحدہ رُوس کا شیرازہ بکھرنے کے بعد 1990ء میں مُجھے چرچ کی جانب سے ممبر پارلیمنٹ نامزد کیا گیا اور میں چار سال تک رُوسی پارلیمنٹ کا ممبر رہا۔ پارلیمنٹ میں مجھے بین المذاہب کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے میں نے مذہبی آزادی کا قانون بنایا، جس سے رُوس کے لوگوں کو اپنی اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کی آزادی ملی۔ پارلیمنٹ کی چار سالہ مُدت پوری ہوئی تو میں چرچ میں دوبارہ پادری کی ذمہ داری نبھانے لگا۔

جب میں پارلیمنٹ اور بین الذاہب کمیٹی کے فرائض سے فارغ ہوا تو میرا زیادہ وقت چرچ کے امور میں گذرنے لگا۔ میں نے عیسائیت کا باریک بینی سے سے جائزہ لینا شروع کیا۔ عقیدۂ تثلیث اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو خدا کا بیٹا کہنا عقل سے بعید تھا۔ عیسائیت کے بارے میں شکوک مُجھے مذہب سے دور لے گئے۔ اب میں خود کو غیر عیسائی سمجھنے لگا اور مذہب کے بغیر خدا کی وحدانیت پر یقین کرنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دُنیا میں اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا بھی کوئی مذہب ہے۔ اسلام کے بارے میں تھوڑی شُدبد ہوئی تو میں نے قُرآن کا روسی زبان میں ترجمہ لے کر پڑھا جو "کراچووسکی" نے کیا تھا۔ سچ پوچھیں تو تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اتفاق سے میں مسلمانوں کے تہوار عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے روسی ٹیلیویژن پر ایک پروگرام پیش کیا گیا۔ جِس نے میرے ذہن کے بند دریچوں کو کھول دیا۔ پروگرام سُن کر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اسلام میری رُوح میں سما گیا ہو۔ 1999ء جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے ایک مقالہ لکھا اور میں نے اِس میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

میرا مقالہ شائع ہوا تو یہ میری زندگی کا ایک حُسین دن تھا، مگر اِس مقالہ نے چرچ اور میڈیا کے لوگوں میں ایک ہلچل مچا دی۔ ایک مشہور پادری ہونے کے ناطے سے چرچ میں میری بڑی عزت اور مقام تھا اور میں ممبر پارلیمنٹ اور بین المذاہب کمیٹی کا چیئرمین بھی رہ چکا تھا۔ میڈیا میں ہر اخبار اور میگزین انٹرویو کر کے میرے اسلام قبول کرنے کے متعلق اپنی اپنی کہانیاں

شائع کر رہا تھا۔ ایک ٹیلی ویژن چینل نے مجھے دو سال کیلئے دینی پروگرام کرنے کی پیشکش کر دی، جِسے میں نے قبول کر لیا۔ دوسری جانب آرتھوڈوکس چرچ نے ایک قرارداد کے ذریعے مجھ سمیت میری سات نسلوں پر لعنت بھیجی اور میرے عزیز و اقارب کو بلا کر مجھ سے قطع تعلقی کا حکم دیدیا۔

میرے عزیز و اقارب کی قطع تعلقی دراصل چرچ کیجانب سے نفسیاتی دباؤ کی ایک کوشش تھی۔ اِس سے وقتی طور پر مُجھے تنہائی کا احساس ہونے لگا مگر الحمدوللہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے اِس کٹھن وقت میں سہارا دیا اور مسلمانوں کی اقارب نصیب فرمائی۔ اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتے وقت مُجھے زندگی کی راہگذر پر صرف اسلام کی روشنی نظر آئی تھی، جِسے دیکھ کر میں نے لبیک کہا۔ اِس سے پہلے نہ تو میں کسی مسلمان سے ملا اور نہ ہی کسی نے مجھے اِس کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اسلام قبول کر کے میں نے اللہ کی وحدانیت اور توحید کا اقرار تو کر لیا مگر مجھے احکامِ الٰہی اور نماز کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ پھر میں نے مسلمانوں سے میل جول اور مطالعہ کر کے یہ سب کچھ سیکھ لیا۔

اللہ تعالیٰ نے مُجھ ناچیز کو جستجو کا ہُنر بخشا، جِس کی وجہ سے میں دینِ اسلام کو پانے میں کامیاب ہوا۔ میرے انتہائے شوق نے اسلامی علوم جاننے میں میری بڑی مدد کی۔ اور اللہ کی ذات نے میرے قلم کو طاقت بخشی کہ میں رُوس جیسے بے دین ملک میں اسلام کے علم کی روشنی پھیلاؤں۔ میں نے پہلی کتاب "اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ" ہے۔ اِس میں میں نے اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب کئی بار شائع ہو چکی ہے اور اس کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر سینکڑوں روسی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ میری دوسری کتاب "مقدماتِ شرک" ہے۔ اِس میں توحید کے فلسفہ سے شرک کو غلط ثابت کیا ہے۔ یہ پڑھے لکھے طبقے کے لوگوں کیلئے ہے میری تیسری کتاب "انجیل ایک نو مسلم کی نظر میں" اِس کتاب میں شائستہ بیانی اور معروضی انداز میں انجیل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اِس کتاب قدیم مسیحی عُلماء کے حوالوں سے بات کئی گئی ہے۔ اِس کے علاوہ بھی میں نے بہت سے مقالے تحریر کئے ہیں۔

میں "صراطِ مستقیم" نامی اسلامی تنظیم کا عُہدیدار بھی ہوں، اِس کا مرکزی دفتر ماسکو میں ہے۔ اِس تنظیم کا کام غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا اور نو مسلموں کی رہنمائی کرنا ہے۔ تنظیم کی ویب سائیٹ کو بھی انٹرنیٹ پر متعارف کرایا گیا ہے۔ میں نے اپنا زیادہ وقت اسلام کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مُسلم صحافیوں کی یونین اور مذہبی امور کے مفتی کے مشیر

کی حیثیت سے بھی کام کر رہا ہوں۔

روس میں ہم نو مسلموں کیلئے بڑے مسائل ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اپنے عزیز و اقارب سے قطع تعلق ہو جاتے ہیں، اور پیدائشی مسلمان اُنہیں قبول کرنے میں پس و پیش ہوتے ہیں۔ مسجدوں میں بھی اُنہیں عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ اُنکی نماز و عبادات میں پیدائشی مسلمانوں کی طرح پختگی نہیں ہوتی۔ ماسکو میں اسلام قبول کرنیوالوں کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ اِن میں ڈاکٹر، انجنیئرز، اساتذہ، طلبا اور وُکلاء شامل ہیں، اور ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ایسے ادارے کی یہاں اِس وقت سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ دوسرا بڑا مسلہٴ نو مسلم خواتین کیلئے ہے کہ اُنہیں پرانے مسلمانوں کی جانب سے پذیرائی نہیں ملتی۔ ہماری کوشش ہے کہ ایک ادارہ قائم کر کے اِن مسائل اور فاصلوں کو کم کیا جائے۔

روس میں اسلام کی تعلیم اور تبلیغ کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی کتابوں بشمول قُرآن و حدیث کا روسی زبان میں بہترین ترجمہ کر کے اُنکی اشاعت کی جائے۔ یہاں پر رہنے والے لوگ زیادہ تر کیمونسٹ ہیں، اُن کے نزدیک اللہ اور مذہب کا کوئی وجود نہیں، جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُس کا صلہ دُنیا میں ہی پالیں گے۔ اُنہیں یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ نظامِ کائنات کو چلانے والی ہستی موجود ہے اور موت کے بعد اُنہیں جزا و سزا کے عمل سے گُذرنا پڑے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تبلیغ اور اشاعتِ دین کو بہتر بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت، حوصلہ اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جولین فرانسس داس

اور پھر میں نے اسلام قبول کر لیا

میں نے جنوبی ہند کے مشہور شہر بنگلور میں ایک رومن کیتھولک عیسائی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میرے ماں باپ نے میرا نام جولین فرانسس داس رکھا۔ میری تعلیم مکمل ہوئی تو مجھے مناسب سا روزگار مل گیا۔ بنگلور چرچ آف کرائسٹ نامی تنظیم نے مجھے ممبر شپ کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ ایک پادری کی زیرِ نگرانی میری تربیت مکمل ہوئی تو میں بھی تنظیم کی دعوت کے فروغ میں مصروف ہو گیا۔

یہ 1992ء کی بات ہے، میں ایک مسلمان کی دکان پر کام کرتا تھا۔ ایک دن دکان کے مالک نے مجھے احمد دیدات کی ایک کتاب لا کر دی۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا۔ کتاب میں عیسائیت اور اسلام کا موازنہ کر کے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام ہی سچا دین ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی تحریر نے عیسائیت پر میرے ایمان کو متزلزل کر دیا تھا۔ کتاب کی پُشت پر ادارے کے جانب سے شائع کی گئیں کتابوں کی فہرست دی گئی تھی اور نیچے ساؤتھ افریقہ کے دعوتی مرکز کا پتہ دیا گیا تھا۔ میں نے چند کتابیں منتخب کر کے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے یہ کتابیں بھجوا دیں۔ چند ہی دنوں بعد مجھے وہ کتابیں مل گئیں۔ میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا اب میں جب چرچ جاتا تو فادر سے مذہب کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات ضرور کرتا۔ جلد ہی وہ جان گیا کہ میں کسی اور سمت جا رہا ہوں۔ چرچ والوں نے اِس بدلتی ہوئی کیفیت کی وجہ سے مجھے تنظیم سے خارج کر دیا۔

میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا اُنہوں نے 1995ء میں میرا ٹرانسفر دہلی میں کر دیا۔ ایک روز میں جامع مسجد گیا اور وہاں سے نماز کی کتاب خرید لایا۔ میں نے نماز اور دُعائیں سیکھنا شروع کر دیں۔ اگرچہ میں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا مگر میں جب نماز پڑھتا تو مجھے عجیب سا روحانی سکون ملتا تھا۔ رمضان کا مبارک مہینہ آیا تو میں نے روزے بھی رکھے۔ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام کے راستے پر لا رہا تھا۔ اچانک کمپنی نے میرا ٹرانسفر انڈونیشیا کر دیا۔ احمد دیدات کی تحریروں اور ٹی وی پروگراموں نے اسلام کو سمجھنے میں میری کافی مدد کی۔ انٹرنیٹ پر قُرآن کی تلاوت میں بڑے شوق سے سنتا تھا۔ ایک دن میں نے قاری صداقت علی کی آواز میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت اور ترجمہ سنا تو یوں محسوس ہوا کہ سورۂ کا ایک ایک لفظ میری روح

میں اتر گیا ہے۔ مُجھے سورۂ رحمٰن اتنی پسند آئی کہ میں نے اِسے زبانی یاد کرنا شروع کر دیا۔ میں روزانہ دو آیتیں یاد کر لیتا تھا اور یوں میں نے چند ہی ہفتوں میں پوری سورۂ رحمٰن یاد کر لی۔

اسلام کے اتنا قریب ہو جانے کے بعد میں اِسے قبول کرنے میں تذبذب کا شکار تھا۔ میرا بچپن ایک ایسے محلے میں گذرا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہ لوگ قُرآن میں بتائے گئے مسلمانوں سے علیحدہ صفات کے لوگ تھے۔ کیا میں بھی ایسا ہی مسلمان بنوں گا؟ قُرآن اور مسلمانوں کے کردار میں تضاد مجھے اسلام قبول کرنے سے روکے ہوئے تھا۔

وَٱللَّهُ يَهۡدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَاطٖ مُّسۡتَقِيمٍ ﴿البقرہ۔ 213﴾

اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے۔

انڈونیشیا میں میری دوستی ایک مسلمان سے ہو گئی۔ وہ مجھے اکثر اپنے گھر لے جاتا اور اسلام کے بارے میں مفید باتیں بتاتا۔ وہ میرے اسلام نہ لانے کی کیفیت کو سمجھ گیا تھا۔ پھر اُس نے مجھے سمجھایا کہ اسلام تو اللہ کا دین ہے، اِن مسلمانوں کا نہیں۔ تم اللہ کے دین میں داخل ہو کر اور اُس پر عمل کر کے ایک بہتر مسلمان بن سکتے ہو اور پھر تم جانتے ہو کہ نیک اور پرہیز گار مسلمانوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ اُس دوست کی باتیں مجھے اچھی لگیں اور میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی دُھند صاف ہو گئی اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔ اب میرا اسلامی نام "اسماعیل" ہے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے مُجھے بہت جلد غُصہ آجاتا تھا اور میرے غُصے کی زیادہ شکار میری بیوی ہوتی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے قُرآن کا مفہوم کیساتھ باقاعدگی سے مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک دن جب میں نے یہ آیت پڑھی تو مجھ میں یکسر تبدیلی آگئی:

ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي ٱلسَّرَّآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَٱلۡكَٰظِمِينَ ٱلۡغَيۡظَ وَٱلۡعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاسِۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿العمران۔ 134﴾

جو آسودگی اور تنگی میں اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غُصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ نیک لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

اب میں بالکل نرم مزاج ہو گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں واضع کر دیا ہے کہ میرے قرب یعنی جنت کے حقدار وہ لوگ ہونگے جو ہر حال میں اپنا مال میری راہ میں خرچ کریں گے۔ دوسروں کی خطاؤں کو معاف کریں گے اور اپنے غُصے پر قابو

پائیں گے۔ اب مجھے کسی بات پہ غُصہ نہیں آتا۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ دینِ اسلام میں بہت وسعت ہے۔ قُرآنِ کریم میں تمام انسانی مسائل کا حل موجود ہے۔ مسلمان کسی بھی عقیدے سے تعلق رکھتا ہو سب کا قُرآن ایک ہی ہے۔ مسلمانوں کو پانچ وقت نماز کیلئے پابند کیا ہے۔ جبکہ عیسائیوں میں ہر فرقے کی انجیل میں فرق موجود ہے اور پھر یہ لوگ صرف ایک روز (اتوار) چرچ جاتے ہیں اور اُنکی عبادتوں میں شرک کا پہلو موجود ہوتا ہے۔

میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں، نمازِ فجر کے بعد باقاعدگی سے قُرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہوں اور ترجمہ بھی پڑھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مُجھے تہجد پڑھنے کی نعمت سے بھی نوازا ہے اور تہجد کی نماز ادا کرنا اب میرا معمول بن چکا ہے۔ احادیث کی کتاب بخاری شریف کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں اور میں اب تک چار سو احادیث زبانی یاد کر چکا ہوں۔ روزانہ آدھا گھنٹہ میں اپنے عیسائی دوستوں کو اسلامی مواد بھیجنے اور اُن کے سوالوں کے جواب دینے میں لگاتا ہوں۔

اسماعیل بھائی کے قبولِ اسلام کے بعد اُن کی زندگی میں آنیوالی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر اُنکی اہلیہ بھی اسلام قبول کر چکی ہیں ۔اُنکا ایک گیارہ سالہ بیٹا اور نو سالہ بیٹی بنگلور میں زیرِ تعلیم ہیں۔ وہ بھی ذہنی طور پر اسلام لانے کیلئے تیار ہیں مگر انڈیا کے تبدیلیٔ مذہب کے قانون میں عُمر کی پابندی کے باعث وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ قانونی تقاضے کے مطابق عُمر کی حد پوری ہوتے ہی وہ انشااللہ اسلام قبول کر لیں گے۔

اسماعیل کی بیوی کہتی ہیں: اسلام قبول کرنے کے بعد میرے شوہر کی زندگی بہت بدل چکی ہے۔ مجھے اِس بات پر رنج ہوا کہ انہوں نے زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرتے وقت مجھے اعتماد میں نہیں لیا۔ پہلے وہ بات بات پر ناراض ہو جایا کرتے تھے اور اب وہ بڑے نرم مزاج ہو گئے ہیں۔ آخر ایک دن مجھے انہوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق بتا دیا اور مجھے بھی اسلام کی دعوت دی۔ اُس وقت میرے ذہن میں مسلمانوں کا تصور کچھ اچھا نہ تھا۔ میرے والد کے پڑوسی ایک مسلمان تھے اور انہوں نے دھوکے سے میرے والد کی زمین اپنے نام منتقل کروالی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنے شوہر پر ترس آتا، مگر جب میں اُنہیں دیکھتی تو احساس ہوتا کہ سب مسلمان ایسے نہیں ہوتے۔ پھر میں نے ماہِ رمضان کا کرشمہ دیکھا کہ وہ شخص جس نے میرے والد کی زمین ہتھیالی تھی، میرے والد پاس آیا اور اپنی زیادتی کی معافی مانگتے ہوئے انہیں ساتھ لیکر گیا اور ساری زمین واپس

انکے نام لگوادی۔اِس واقعہ سے میرے ذہن کی بدگمانی میں کمی آگئی اور میرا جھکاؤ اسلام کی جانب ہونے لگا۔ ایک رات نمازِ عشا کے بعد کچھ لوگ میرے شوہر کے ساتھ ہمارے گھر آئے اور مجھے اسلام کی دعوت دی۔ میں نے اپنی بدگمانیاں انہیں بتائیں جو انہوں نے دور کر دیں۔ انہوں نے بتایا کہ کسی کے انفرادی فعل کی وجہ سے اسلام کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا اور کسی بھی مذہب کے سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر مسلمان اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا جوابدہ ہے۔ میں دلی طور پر اسلام سے متاثر تھی اور پھر یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا موقع تھا۔ میں نے خوشدلی سے اپنے مکمل ہوش و حواص کیساتھ ان لوگوں کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا اور میں اپنے اِس فیصلے پر خوش ہوں۔

اسلام کے متعلق اسماعیل کی بیوی کے خوبصورت الفاظ:

"میں نے اسلام کی صداقت کو اُسی وقت جان لیا تھا جب میں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے شوہر کی زندگی کو بالکل بدلا ہوا پایا"

انہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قُرآن میں فرمایا:

وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لاَ يَكُونُوا أَمْثَالَكُم ﴿محمد۔38﴾

اگر تم اللہ سے منہ پھیر لوگے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئیگا جو تمہارے جیسے نہیں ہونگے۔

اللہ تعالیٰ! سب مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی استقامت عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین

یُوسف یوحنا

پاکستانی کرکٹر محمد یوسف کا قبول اسلام

میرے والدین ریلوے کالونی گڑھی شاہو لاہور میں رہتے تھے۔ اگرچہ ریلوے کالونی میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی، لیکن یہیں پر کچھ گھر عیسائیوں کے بھی تھے۔ میں یہیں پر پلا بڑھا، چونکہ عیسائی اور مسلمان ساتھ ساتھ آباد تھے، اس لئے میری دوستی اور اُٹھنا بیٹھنا زیادہ تر مسلمان لڑکوں کیساتھ تھا۔ لڑکپن میں اپنے مسلمان دوستوں کیساتھ کھیلتے کودتے مُجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی کہ میں اسلام کی طرف متوجہ ہوتا۔ اسکول سے میٹرک پاس کیا تو مزید تعلیم کیلئے ایف سی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسکول سے کالج آیا تو میرے دوست و احباب بھی بدل گئے۔ یہیں پر میری دوستی جاوید انور نامی لڑکے سے ہوگئی۔ جاوید انور کرکٹر سعید انور کا چھوٹا بھائی ہے۔ میں بھی کرکٹ کھیلنے کا شوقین تھا، اس لئے اکثر جاوید انور کیساتھ اُس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں اکثر میری ملاقات کرکٹر ذوالقرنین حیدر سے ہو جایا کرتی تھی۔ ذوالقرنین حیدر کی تبلیغی جماعت سے بڑی گہری وابستگی تھی، وہ محفل میں اکثر دوستوں کو نماز اور روزے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ شروع شروع میں سعید بھائی کا مذہب کی طرف رجحان نہیں تھا، اِس لئے میری موجودگی میں جب ذوالقرنین حیدر یا تبلیغی جماعت کے لوگ سعید بھائی سے

ملنے آتے تو وہ مجھے دروازے پر بھیج دیتے کہ اُنہیں بتادو کہ سعید گھر پر نہیں ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ سعید بھائی کا رجحان آہستہ آہستہ مذہب کی طرف ہونے لگا ہے۔ اُن کا ذوالقرنین حیدر اور تبلیغی جماعت والے لوگوں سے میل جول بڑھنے لگا۔ پھر اچانک اُنکی بیٹی کا انتقال ہو گیا اور اُن کا رجحان مذہب کی طرف بہت بڑھ گیا، اب وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ دوروں پر بھی جانے لگے۔

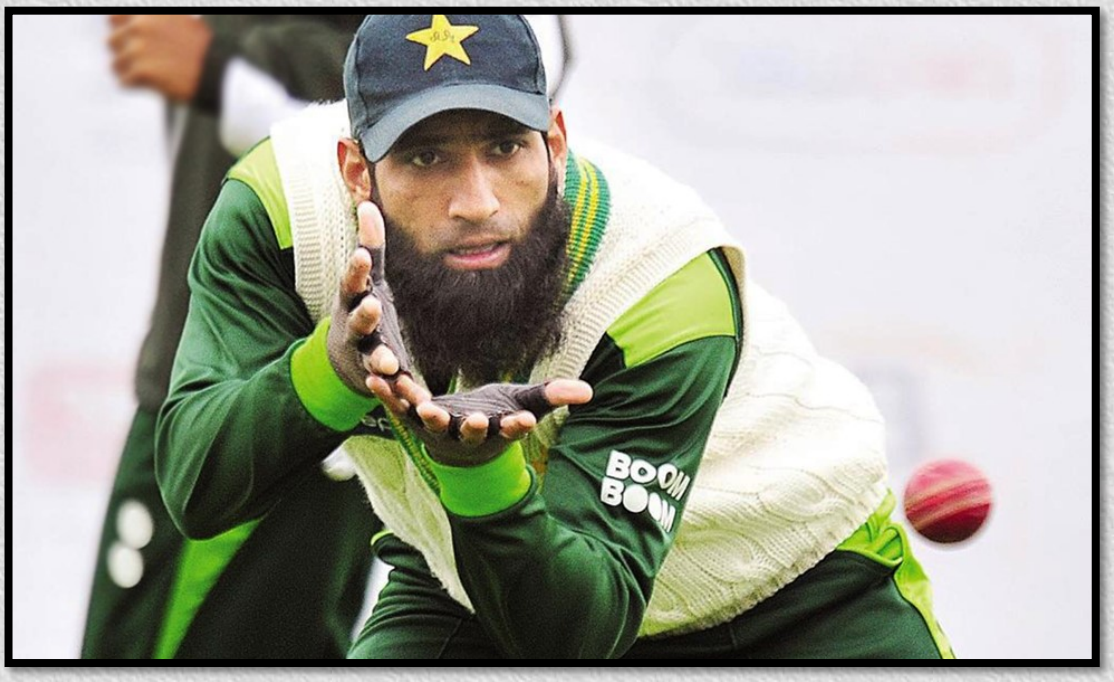

میں بھی 1998ء میں پاکستان کرکٹ ٹیم میں شامل ہو گیا۔ اِس ناطے سے میرا سعید بھائی سے رابطہ اور بھی بڑھ گیا۔ سعید بھائی نے مجھے کبھی بھی اسلام قبول کرنے کیلئے نہیں کہا، مگر وہ مجھے یہ ضرور کہتے تھے: یوسف! سونے سے پہلے یہ دُعا ضرور مانگا کرو کہ اے خدا! تو مجھے حق اور سچ کا رستہ دکھادے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی کے بڑھتے ہوئے مذہبی رُجحان کا اثر مجھ پر بھی ہونے لگا تھا۔

کرکٹ کے ناطے سے میری وقار احمد کے ساتھ بھی گہری دوستی تھی۔ ایک رات میں سعید بھائی کی بتائی ہوئی دعا مانگ کر لیٹا کہ: اے خدا! تو مجھے حق اور سچ کا رستہ دکھادے۔ جلد ہی میں نیند کی وادیوں میں چلا گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وقار احمد میرے پاس آیا، وہ بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ آتے ہی مجھے کہنے لگا: یوسف! سنا ہے کہ تم مسلمان ہو گئے ہو؟
میں نے خاموشی اختیار کرلی اور اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھ کھلی تو میں نے سوچا کہ کیا واقعی اللہ نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے؟ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

وقار احمد کا تعلق شیخوپورہ سے تھا اور اتفاق سے اُنہی دنوں پی آئی اے اور نیشنل بنک کے درمیان ایک کرکٹ میچ شیخوپورہ میں کھیلنے کا فیصلہ ہوا۔ میں پی آئی اے کی طرف سے کھیل رہا تھا اِس لئے اپنا سامان اُٹھائے شیخوپورہ پہنچ گیا۔ وقار احمد جانتا تھا کہ میں میچ کھیلنے آؤنگا اِس لئے وہ مُجھے ملنے کیلئے آگیا۔ اُس کی وضع قطع اور چلنے کا انداز دیکھ کر مجھے لگا کہ شائد پھر وہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں اُس وقت اور بھی حیران رہ گیا کہ جب وقار احمد نے بالکل خواب کے انداز میں مُجھ پُوچھا: یوسف! سنا ہے کہ تم مسلمان ہو گئے ہو؟ اُس کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر میں اُسے تکتا رہ گیا۔ اب مُجھے یقین ہو گیا تھا کہ اللہ نے میری دُعائیں سُن لی ہیں اور مجھے حق اور سچ کا راستہ دکھا دیا ہے۔

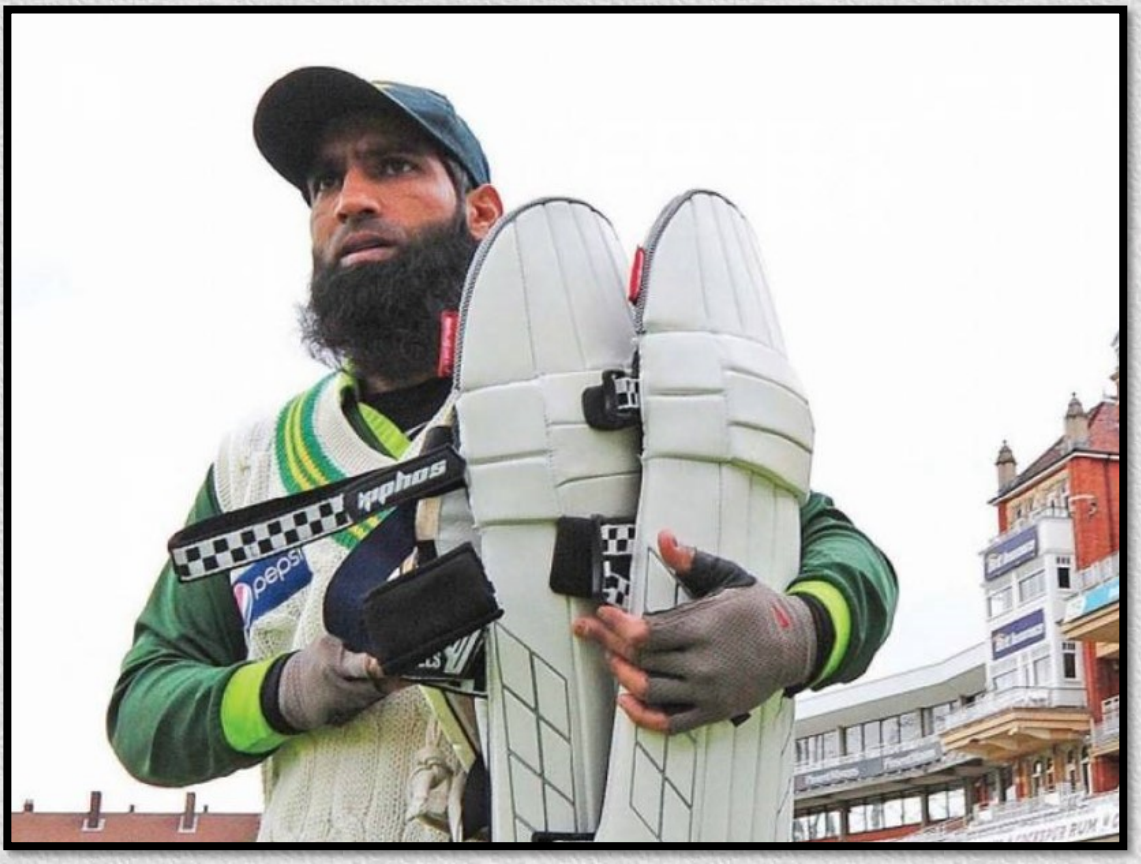

میچ ختم ہوا تو میں شیخوپورہ سے لاہور آیا اور سیدھا کیولری گراؤنڈ سعید بھائی کے گھر پہنچا۔ یہ اکتوبر 2002ء کا ذکر ہے۔ ملنے کے بعد سب سے پہلے میں نے سعید بھائی سے کہا: مُجھے حق اور سچ کا راستہ نظر آگیا ہے اور اب میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ سعید بھائی نے مُجھے گلے سے لگایا اور پھر مُجھے کلمہ پڑھایا۔ کلمہ پڑھتے ہی مُجھے لگا کہ میری دنیا بدل چکی ہے۔ میں نے اسلامی تعلیمات کیلئے رائیونڈ بھی جانا شروع کر دیا وہاں میری مُلاقات حاجی عبدالوہاب، مولانا طارق جمیل اور مولوی فہیم صاحب سے ہوتی

رہتی تھی۔ انضمام بھائی کو پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوئے اور شفقت کا اظہار کیا۔

میں نے حاجی عبد الوہاب سے مشورہ لیا کہ کیا مُجھے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دینا چاہئیے؟ حاجی عبد الوہاب صاحب نے کہا کہ ابھی نہیں۔ میں نے اپنی بیوی تانیہ کو اعتماد میں لیکر اُسے بتا دیا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور اُسے بھی اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اُسے اپنے مسلمان دوستوں کی بیویوں سے ملوایا اور مستورات کی تعلیم میں بھی اپنی اہلیہ کو لیکر گیا۔ جلد ہی اُس کے ذہن نے میرے اسلام لانے سے آنیوالی تبدیلی کو قبول کر لیا اور وہ بھی اب مسلمان ہونا چاہتی تھی۔

قارئین! یہاں سے کچھ واقعہ ہم بھائی نعیم صاحب کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ محترم نعیم صاحب تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور محمد یوسف کے گھر کے نزدیک ہی رہتے تھے اور دوست بھی تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

محمد یوسف کا گھر میرے گھر کے قریب ہی تھا اِس لئے اُن کا ہمارے گھر میں کافی آنا جانا تھا۔ محمد یوسف کی بیوی پردہ نہیں کرتی تھی البتہ میں اُس سے پردہ کر لیا کرتا تھا۔ ایک روز محمد یوسف کی بیوی تانیہ اپنے بچوں کیساتھ میرے گھر آئی اور کہنے لگی: نعیم بھائی! میرے بچوں کے کان میں اذان دیدیں۔

میں نے کہا: آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

ہاں نعیم بھائی! میں بھی مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔

میں نے بچوں کے کان میں اذان دیدی مگر محمد یوسف کی بیوی کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا۔ اُنہیں کلمہ پڑھانے سے پہلے میں نے مولانا طارق جمیل صاحب کی رائے لی تو اُنہوں نے کہا کہ اُنہیں پردے میں بٹھا کر آپ کلمہ پڑھا دیں۔ میں نے اُنہیں پردے میں بٹھایا، میری بیوی اور بیٹی اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھا: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''

اُنہوں نے بھی کلمہ کے الفاظ ادا کئے: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''

اور الحمدللہ مسلمان ہو گئیں۔ تانیہ نے اپنے لئے اسلامی نام فاطمہ پسند کیا اور یوں وہ عورت جو تانیہ کے نام سے میرے گھر میں داخل ہوئی تھی، اب فاطمہ بن کر واپس لوٹ رہی تھی۔

میری بیوی اور بیٹی نے قسم اُٹھا کر بتایا کہ جونہی یوسف کی بیوی نے کلمہ پڑھا، ہمیں ایسا لگا کہ جیسے ہمارا کمرہ نُور سے بھر گیا ہو۔

محمد یوسف کی داستان دوبارہ اُنہی کی زبانی پیش ہے:

ہماری کرکٹ ٹیم 2005ء میں سعودی عرب کچھ میچز کھیلنے گئی۔ کچھ وجوہات کی بنا پر میچز تو نہ ہو سکے مگر پوری ٹیم نے عُمرہ ادا کیا۔ میری بیوی بھی میرے ہمراہ تھی اور وہ بھی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اپنی مرضی سے مسلمان ہو چکی تھی۔ مُجھے اور میری بیوی کو سخت بیتابی تھی کہ ہم بھی عُمرہ کی سعادت حاصل کریں۔ میں نے اپنی خواہش کا اظہار رائیونڈ فون کر کے مولوی فہیم صاحب سے کیا تو اُنہوں نے مکہ میں موجود ایک شخص عالمگیر صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ہمیں عُمرہ کروائیں۔ عالمگیر صاحب ہمیں رات گئے حرم شریف لے گئے اور یوں میں اور میری بیوی نے عُمرہ ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ عُمرہ کی ادائیگی سے فارغ ہوئے تو صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ میں نے فون کر کے مولوی فہیم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اُنہوں نے حاجی عبدالوہاب صاحب سے مشورہ کر کے مُجھے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کرنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ میں نے پاکستان پہنچتے ہی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہ بھی معجزہ ہی ہے کہ اللہ نے میرے گھر میں پہلے ہی سے اسلام کے پودے لگا دیئے تھے میں نے پہلے ہی اپنی بیٹی کا نام انیقہ یوسف اور بیٹے کا نام دانیال یوسف رکھا تھا، میری بیوی تانیہ اب فاطمہ بن چکی ہے۔ میرے والد صاحب نے میرے قبولِ اسلام پر برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ میری والدہ میرے اِس فعل سے کچھ رنجیدہ ہوئیں مگر اب حالات معمول پر آرہے ہیں۔ میں اپنے والدین اور پورے خاندان کیلیئے بھی دُعا گو ہوں کہ اللہ اُنہیں بھی حق اور سچ کا راستہ دکھا دے۔ آمین

ٹیری ہولڈ بروکس

گوانتانامو کا محافظ مسلمان ہو گیا

اسلام کا اِرتقاء اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ دنیا میں ہم مسلمانوں کے کردار نے کوئی مثبت نقوش نہیں چھوڑے، لیکن پھر بھی اسلام کے اِرتقاء کا عمل جاری ہے۔ ٹیری ہولڈ بروکس جسے 2003ء میں امریکن حکومت نے گوانتانامو کے قید خانے میں مسلمان قیدیوں کو اذیتیں دینے کیلئے بھیجا تھا۔ الحمدواللہ وہ "مصطفےٰ عبداللہ" بن کر لوٹا۔

مصطفےٰ عبداللہ (ٹیری ہولڈ بروکس) نے مئی 2013ء میں امریکی ریاست الباما کے اسلامک سینٹر میں مسلمان عمائدین اور میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے اپنے ایمان لانے کی داستان بیان کی۔

میرے مسلمان ہونے کا سبب گوانتامو میں قید مسلمان قیدیوں کا صبر و استقامت، سکونِ قلب اور اُن کا بلند کردار تھا۔ میں ان قیدیوں کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ قید و بند کی صعوبتوں اور سکیورٹی گارڈز کی طرف سے پہنچائی جانیوالی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کے باوجود ان کے چہروں پر اطمینان اور سکون نظر آتا تھا۔ یہ لوگ پھر بھی اپنی نمازوں اور عبادات میں مشغول رہتے تھے۔ اور ان مصیبتوں پر کسی ناشکری کا اظہار یا شکوہ زبان پر نہ لاتے تھے۔ میں یہ سوچتا تھا کہ میں ہر سہولت موجود ہونے کے

باوجود اس لذت سے کیوں محروم ہوں۔ دنیا و جہاں کی نعمتیں میرے پاس ہیں، مگر نہ تو میری زندگی میں سکون ہے اور نہ ہی اطمینانِ قلب جیسی نعمت سے آشنا ہوں۔

ایک روسی جریدہ "ٹائمز آف رشیا" ٹیری ہولڈ بروکس کے حوالے سے لکھتا ہے کہ گوانتامو میں قید لوگوں کیساتھ غیر انسانی سلوک کیا جارہا ہے۔ فلوریڈا میں مسلمانوں اور میڈیا سے مخاطب ہوتے ہوئے ٹیری ہولڈ بروکس نے کہا کہ گوانتامو میں پچاس کے قریب ایسے لوگ قید ہیں، جن کو امریکی محکمۂ دفاع بیگناہ قرار دے چکا ہے۔ محکمۂ دفاع نے ان لوگوں کے وکلاؤ کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے، لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو متعلقہ حکومتیں واپس لینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ کچھ ذرائع یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکی حکومت ہی ان کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ واللہ اعلم

ٹیری ہولڈ بروکس نے اپنی داستان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ جب مجھے گوانتانامو قید خانے میں تعینات کیا گیا تو مجھے ہدایات ملیں کہ ان قیدیوں کو ہر ممکن تکلیف پہنچانی ہے۔ گفتگو میں سختی اختیار کریں اور ہر دو گھنٹے بعد قیدیوں کو دوسرے سیل میں منتقل کر دیا جائے۔ تاکہ یہ لوگ آرام و سکون نہ رہ سکیں۔ میں نے ڈیوٹی پر آنے کے بعد تمام ہدایات پر عمل کیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ مسلمان قیدی اس منتقلی پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے تھے، البتہ میں اِس ڈیوٹی سے جھنجھٹ کا شکار ہونے لگا۔ ٹیری ہولڈ بروکس کا کہنا ہے کہ مجھے یہ سب عجیب سا لگا اور میں سوچتا تھا کہ لوگ نماز اور عبادات محض دکھاوے کیلئے کرتے ہیں اور جب یہ اکٹھے ہوتے ہونگے تو یہ دہشتگری جیسے منصوبوں پر بات کرتے ہونگے۔ چنانچہ ہم نے کچھ ریکارڈنگ کے خفیہ آلات نصب کئے تاکہ ان کی گفتگو ریکارڈ کر سکیں۔ جب میں نے وہ خُفیہ ریکارڈنگ سنی تو حیرت ہوئی کہ وہ لوگ مذہب، سیاست، تاریخ اور فلسفے پر بات چیت کرتے تھے۔ اب مجھے جُستجو ہوئی کہ میں بھی اس راز کو پاسکوں جو مجھے سکونِ قلب عطا کرے۔

میں نے ایک قیدی سے بات کی تو اُس نے مجھے بتایا کہ ہمارا خدائے واحد پر یقینِ کامل ہے۔ وہی ذات ہماری حفاظت کرنیوالی ہے، دُکھ اور سُکھ سب اُسی کے دم سے ہے۔ اس لئے ہم کوئی شکوہ نہیں کرتے۔ اِس گفتگو کے بعد میں نے اسلامی علوم کے مطالعے کا فیصلہ کیا۔ اِس سے قبل میں عیسائیت، بدھ مت، یہودیت اور ہندوازم کا مطالعہ کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک

برطانوی مسلمان قیدی سے قُرآنِ کریم کے انگریزی نسخے کی استدعا کی تو اُس نے مجھے وہ لا کر دیدیا اور بولا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے قُرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اِس پر عمل کرنے کی توفیق دی۔ اُس نے کہا کہ اب تُم اس الہامی کتاب کو پڑھو اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ اللہ کی ذات ہمیں کیا کہہ رہی ہے۔ میں یہ بھی بتادوں کہ میں نے مسلمانوں کو جس ولولے اور خشوع کیساتھ قُرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اِس نے میرے دل میں بھی تڑپ پیدا کی کہ آخر میں بھی دیکھوں کہ ایسی کون سی بات ہے۔ پھر جب میں نے قُرآنِ پاک کا مطالعہ شروع کیا تو ایک سال کے مطالعے اور تحقیق کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ تحریر کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور یہ کہ قُرآنی تعلیمات انسانی زندگی اور فطرت سے سو فیصد مطابقت رکھتی ہیں۔ چنانچہ میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا (سبحان اللہ) آج میں (الحمدواللہ) "مُصطفٰے عبداللہ" مسلمان ہوں۔

مصطفٰے عبداللہ (ٹیری ہولڈبروکس) نے کئی امریکی ریاستوں میں مسلمان کمیونٹی اور میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ گوانتامو میں مسلمان قیدیوں سے غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے متعدد بار اپنے خطاب میں امریکی حکومت سے

کہا کہ وہ گوانتانامو قید خانے کو فی الفور بند کرے اور بیگناہ قیدیوں کو انکے گھر واپس جانے دے۔ مُصطفےٰ عبداللہ نے مسلم کمیونٹی کے لئے متعدد جگہوں پر خطابات کئے۔ امریکی میڈیا اکثر تفصیلات سامنے لانے سے گریز کرتا رہا ہے۔

مُصطفےٰ عبداللہ عُمرہ کی ادائیگی کے دوران

مصطفےٰ عبداللہ نے سعودی حکومت کی دعوت پر سالِ رواں میں سعودی عرب کا دورہ کیا اور انہیں عمرہ ادا کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ٹیری ہولڈبروکس نے گوانتامو میں اپنی یاداشت کے حوالے سے پانچ سو صفحات کی ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

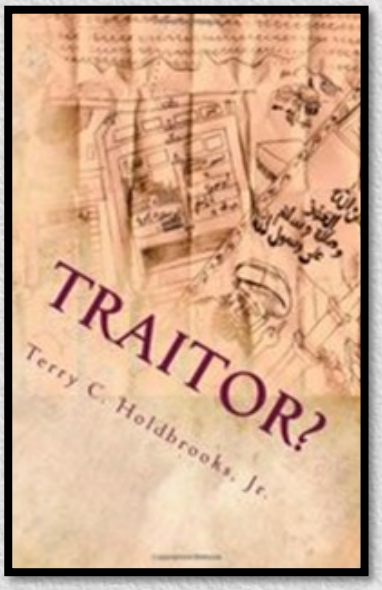

جیمس گرانٹ

افغانستان میں امریکی فوجی کا قبولِ اِسلام

اسلام قبول کرنیوالے جیمس گرانٹ کا تعلق امریکی ریاست ٹینسی سے ہے۔وہ امریکی فوج میں آفیسر تھے۔اُنہیں امریکی فوجی دستے کے ساتھ افغانستان کے صُوبے کنڑ ضلع واٹاپور میں تعینات کیا گیا۔اُن کا کہنا ہے کہ افغانستان میں رہ کر وہ مسلمانوں کے معاشرے اور کردار سے بُہت متاثر ہوئے۔اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اسلام کے بارے میں مطالعہ ضرور کریں گے۔اُنہوں نے مطالعہ کیلئے کچھ اسلامی مواد اکٹھا کیا اور پڑھنا شروع کیا۔سات ماہ تک اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ دُنیا میں اسلام ہی سچا دین ہے۔

جیمس گرانٹ نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اُنہوں نے افغان لوگوں کے مجمع اور امریکی آرمی آفیسرز کی موجودگی میں مُسلم اسکالر حمید اللہ کے ہاتھوں کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

مُحترم حمید اللہ صاحب افغانستان میں امریکی فوج کے معاون تھے۔ جیمس گرانٹ کا اسلامی نام "محمد آصف" رکھا گیا۔

محمد آصف (جیمس گرانٹ) دو بچوں کا باپ ہے۔ میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے محمد آصف نے بتایا کہ میری بیوی نے میرے قبولِ اسلام کی مخالفت نہیں کی۔ میری کوشش ہے کہ پہلے میں اپنے خاندان والوں کو مسلمان بناؤں اور پھر دوسروں میں تبلیغ

عمل شروع کروں۔

جیمس گرانٹ اسلامی اسکالر اور یو ایس آرمی معاون حمید اللہ کے ساتھ

حالیہ برسوں میں امریکی فوجیوں کے بارے میں باقاعدگی سے مرتب کی گئی رپورٹوں میں کہا گیا ہے۔ امریکی فوجی آپریشنز کے دوران مسلمانوں کے کردار اور روے سے متاثر ہو کر بہت سے فوجیوں اور فوجی آفیسروں نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام کے ارتقاء کا عمل مسلسل جاری ہے۔ 2007ء میں افغانستان سے آنیوالی ایک رپورٹ کے مطابق دو امریکی فوجیوں نے اسلام قبول کر کے مسلمان عورتوں سے ایک ایسے ملک میں شادی کی ہے جو حالتِ جنگ میں ہے۔ "ڈیلی ہیواڈ" کے مطابق یہ واقعہ بگرام ائیر بیس پر متعین امریکی فوجی دستوں میں پیش آیا۔ یاد رہے کہ اسی ائیر بیس سے یو ایس آرمی آپریشنز کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ مشرقِ وُسطیٰ اور افغانستان میں امریکہ کو دورانِ آپریشنز فوجیوں اور فوجی افسروں کے اسلام قبول کرنے کے واقعات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اسلام مخالف قوتیں جتنی سازشیں کر کے دُنیا کو مخالف کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ اُتنا ہی اُن

کی قوموں میں اسلام قبول کرنے کا رُجحان بڑھتا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قُرآنِ پاک میں فرمایا ہے۔

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهۡدِيَهُۥ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِۖ۔ ﴿الانعام۔ 73﴾

تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے، اُس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے۔

اِسلام کی وُسعت اور ارتقاء کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذُمے لے رکھا ہے، بیشک اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنیوالا ہے۔ وہی تو ہے جو دشمنوں کی تدبیروں کو اُنہی پر پلٹ دیتا ہے۔

ڈینئل اسٹریچ

سوئس پارلیمنٹیرین اسلام کی جھولی میں آن گرا

سوئٹزرلینڈ یورپ کا خوبصورت اور حُسین ملک ہے۔ جہاں چار لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں جو کُل آبادی کا چار فیصد ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں دوسو مساجد ہیں۔ جن میں صرف چار مساجد کے مینار ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں مقیم مسلمانوں کی اکثریت ترکی اور بلقان سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے۔

ڈینیل اسٹریچ سوئس پیپلز پارٹی کے انُ سرگرم لیڈروں میں سے تھے جو سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی لگوانے میں پیش پیش تھے۔ اسی تحریک کے دوران ایک ریفرنڈم میں سوئٹزرلینڈ کے چھبیس حلقوں کے 113540 لوگوں نے میناروں پر پابندی کے حق میں ووٹ دیئے جو دیئے گئے ووٹوں کا 57.5 فیصد تھا۔ 8 جولائی 2008ء ان ووٹروں کے دستخط کیساتھ ایک درخواست سوئس پارلیمنٹ کیں جمع کروائی گئی اور ملک بھر میں مساجد کے میناروں پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا۔ درخواست پر ایکشن لیتے ہوئے 29 نومبر 2009ء کو سوئس پارلیمنٹ میں ووٹنگ ہوئی اور مینار گرانے کے حق قرارداد پاس ہوئی۔

جنیوا کی خوبصورت مسجد جو 1978ء میں بنائی گئی (Petit-Saconnex Mosque)

ریفرنڈم کی حامی سوئس پیپلز پارٹی کا مؤقف تھا کہ:

1۔ مسجد کے مینار مسلمانوں کی سیاسی قوت کی علامت ہیں۔

2۔ یہ مینار میزائل سے مشابہت رکھتے ہیں اس لئے یہ دہشت گردی کی علامت ہے۔

3۔ سوئٹزرلینڈ کو اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ میناروں کے بنانے پر پابندی لگائی جائے۔

سوئس حکومت نے اِس قرارداد کے حق میں ووٹنگ کے نتائج کو تسلیم کرتے ہوئے کہا: پارلیمنٹ میں پاس ہونے والے بل پر حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ مستقبل میں تعمیر ہونیوالی مساجد کیساتھ مینار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ البتہ مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی عبادت کے حق کو بدستور قانونی تحفظ ہو گا۔

حکومت اور پارلیمنٹ بیشتر ارکان اس پابندی کو واضح طور پر مسترد کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ایسا کرنا نہ صرف مسلمانوں

کے ساتھ امتیازی سلوک کے مترادف ہو گا بلکہ یہ انسانی حقوق اور آئین کے بھی منافی ہے۔ کیونکہ ہر مذہب کے لوگ اپنے عبادت خانے مخصوص ڈیزائن سے بناتے ہیں سوئٹزر لینڈ کی وزیر انصاف ایولائین وِڈنر شمپ کا کہنا ہے کہ میناروں پر پابندی سے انتہاپسندانہ رویوں کو تبدیل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی تنظیم نے سوئٹزر لینڈ کے اِس فیصلے کی سخت مذمت کی ہے۔ تنظیم نے اسے متعصبانہ اور بین الاقوامی قوانین کے خلاف قرار دیا ہے۔ سیکرٹری جنرل کی نائب ترجمان نے انسانی حقوق کی ہائی کمشنر کے بیان کے حوالے سے بتایا کہ سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے میناروں کی تعمیر پر لگائی جانیوالی پابندی کو جو ریفرنڈم میں اکثریتی ووٹ کے نتیجے میں عمل میں آئی ہے۔ اس کو انتہائی امتیازی، سوئس سماج کو تقسیم کرنے والا اور بدقسمت فیصلہ کہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس فیصلے سے سوئٹزر لینڈ بین الاقوامی انسانی حقوق کی ذمہ داریوں سے روگردانی کا مرتکب ہو گا۔ ہائی کمشنر نے سوئٹزر لینڈ میں مساجد پر پابندی کے فیصلے کو عدم برداشت اور نسل پرستی پر مبنی سیاست کا وہ تسلسل قرار دیا جس کے تحت اس سے قبل غیر ملکیوں، تارکین وطن اور سیاسی پناہ حاصل کرنے والوں کے خلاف پوسٹر چسپاں کیے جاتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی مذمت کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ سوئٹزر لینڈ سمیت کئی ممالک میں غلط طور پر مسلمانوں سے خوف کے ہیجان پر مبنی سیاسی مہموں نے ایسے فیصلوں کو جنم دیا ہے، اگرچہ سوئٹزر لینڈ کی حکومت نے ریفرنڈم کی حمایت نہیں کی تھی لیکن ایک مخصوص مذہب سے تعلق رکھنے والی علامات یعنی مسلمانوں کی مساجد کے میناروں پر پابندی کا فیصلہ واضح طور پر امتیازی سلوک ظاہر کرتا ہے۔ دوسری طرف فرانس کے وزیرِ خارجہ نے انسانی حقوق کی مسلم تنظیموں اور سوئیس حکومت کا ساتھ دیتے ہوئے سوئٹزر لینڈ میں اس ریفرنڈم کی مذمت کی ہے۔ برنارڈ کوچنر نے اس ووٹنگ کو عدم رواداری کا ایک اظہار قرار دیا ہے۔ جنیوا میں ایک ممتاز بین المذاہب مسلم تنظیم "باہمی مفاہمت کی مسلم کونسل" کے سربراہ نے کہا ہے کہ انہیں ریفرنڈم کے نتائج پر حیرت اور افسوس ہے، انہوں نے کہا ہے کہ انہیں توقع ہے کہ مسلمان اس پابندی کے خلاف انسانی حقوق کی یورپی عدالت میں اپیل دائر کریں گے۔

سوئٹزر لینڈ حکومت کی جانب سے مساجد کے میناروں پر پابندی ایک نہایت افسوس ناک قدم ہے، حکومت کے اس فیصلے سے یورپ سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی ہے، اس فیصلے سے نہ صرف مذاہب کے درمیان فاصلے پیدا

ہوں گے بلکہ غیر مسلموں میں اسلامی اقدار سے نفرت کا اظہار بھی بڑھے گا، سوئٹزرلینڈ حکومت کے اس اقدام سے نہ صرف یورپ بھر میں مذہبی ہم آہنگی کو شدید نقصان پہنچے گا بلکہ اس قسم کے معتصبانہ فیصلے تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کا باعث بھی بنیں گے، مساجد کے مینار اسلام کا علامتی نشان ہیں، ان کی تعمیر پر پابندی اسلام کے خلاف کھلا اعلان جنگ اور عالمی سازشوں کا ایک حصہ ہے، جب تک مسلمانوں نے عزت سے جینا اور مرنا نہیں سیکھا اس وقت مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی سازشیں ہوتی رہیں گی، حقیقت یہ ہے کہ یورپ سمیت دنیا بھر میں مساجد دشمنان اسلام کی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں، کیونکہ مسجد اسلام کا مرکز ہے اور یہاں سے پانچ وقت "اللہ اکبر" کی آواز بلند ہوتی ہے، یورپ میں نماز جمعہ اور رمضان المبارک میں مساجد نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں، وہاں کے تعلیمی اداروں سے سینکڑوں مسلمان بچیاں روزانہ سکارف پہنے نکلتی ہیں، جبکہ مسلم نوجوان داڑھیاں رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے تھنک ٹینک سر پکڑ کر بیٹھے سوچتے ہیں کہ اسلام کو پھیلنے سے کیسے روکا جائے۔

ڈینیل اسٹریچ کہتے ہیں کہ جب 2008ء میں میناروں کے خلاف مہم کا آغاز کیا گیا تھا تو اُس وقت وہ اپنے دل میں عجیب سی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ لیکن پارٹی اور ساتھیوں کے دباؤ کی وجہ سے وہ مجبوراً مہم میں شامل ہوئے۔ وہ وقتاً فوقتاً اسلام کا مطالعہ کرتے رہتے تھے اور ساتھیوں سے اسلام کے خلاف مواد اکٹھا کرنے کا بہانہ کرتے۔ درحقیقت وہ اسلام کی جانب راغب ہو رہے تھے مگر حتمی نتیجے تک پہنچنے سے قبل وہ اس بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ اسلامی تعلیمات نے ڈینیل اسٹریچ کو حق کا راستہ دکھا دیا۔ 30 جنوری 2010ء کو "دی نیشن" کو انٹرویو دیتے ہوئے ڈینیل اسٹریچ نے اسلام قبول کرنے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ جبکہ مسلم تنظیموں کے بلاگز اور نیوز میں پہلے ہی یہ خبر گردش کرنے لگ گئی تھی۔ ڈینیل اسٹریچ کا کہنا ہے کہ مجھے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ میں نے انجانے میں مساجد اور میناروں کے خلاف مہم میں حصہ لیکر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اپنی غلطی کی تلافی کیلئے انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں سب سے بڑی میناروں والی مسجد بنانے کے متعلق سوچا۔ لیکن اِس کیلئے انہیں قانونی جنگ لڑنا ہو گی۔

ڈینیل اسٹریچ کا کہنا ہے کہ میں نے قُرآن اور نماز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دی ہے اور مجھے اسلام میں ہر اُس سوال کا جواب مل گیا ہے جو میں عیسائیت میں کبھی نہیں پا سکتا تھا۔ مقامی شدت پسند تنظیموں اور غیر مُسلم ماہرین کا خیال تھا کہ ڈینیل

اسٹریچ پر سوار اسلام کا بھوت آہستہ آہستہ اُتر جائیگا۔ لیکن حال ہی میں ڈینیل اسٹریچ کی جانب سے سوئیٹزرلینڈ یا یورپ کی سب سے بڑی مسجد کی تعمیر کے لئے جگہ تلاش کرنے کے اعلان نے ایک بار پھر حکومتی و غیر حکومتی حلقوں میں کھلبلی مچادی ہے۔ مقامی مسلمان حلقوں کی جانب سے ڈینیل کے اس اعلان کو اسلام کی سربلندی اور سوئیٹزرلینڈ میں فتح قرار دیا جارہا ہے جبکہ اسلام مخالفین حلقے ڈینیل کو اپنے اس اقدام سے باز رکھنے کے تراکیب لڑانے میں مصروف ہیں۔

اسلامی دینا اور مسلمانوں کے حوالے خبریں ارسال کرنے والی عرب ویب سائٹ اسلام آن لائن کا مقامی ذرائع کے حوالے سے کہنا ہے کہ ڈینیل اور اس کے ساتھ کام کرنے والے دیگر مسلمان تنظیموں کی جانب سے جلد ہی اِس مسجد کے مقام کا تعین کیا جائے گا جس کے بعد جلد ہی قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کا تعمیری کام شروع کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت پورے سوئیٹزرلینڈ میں صرف چار مساجد ایسی پائی جاتی ہیں جن کیساتھ مینار بنائے گئے ہیں جبکہ ڈینیل کی جانب سے پانچویں مرکزی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے حوالے سے کام کیا جارہا ہے۔ جناب ڈینیل اسٹریچ کا کہنا ہے کہ یہ مسجد سوئٹزرلینڈ کی سب سے بڑی اور بلند میناروں والی مسجد ہو گی۔

سوئٹزرلینڈ میں اسلام کیلئے محرک جماعت او پی آئی کے صدر جناب عبدالمجید الداعی کا کہنا ہے کہ یورپ کے لوگ اسلام کے خلاف پھیلائے جانیوالے میڈیا پروپیگنڈے کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں اور ڈینیل اسٹریچ کا قبولِ اسلام اس پروپیگنڈے

کی نفی کرتا ہے۔ دنیا بھر میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق لوگ اسلامی تعلیمات کی حقیقت جاننے کے بعد اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ہی سچا اور دائمی مذہب ہے اور اِس کے اِرتقاء کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے۔ نو مسلموں میں کثیر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے وگرنہ مجموعی طور پر ہم مسلمانوں کا کردار انتہائی مایوس کن ہے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد ڈینیل اسٹریچ نے اپنی پارٹی سے سیاسی وابستگی ختم کرتے ہوئے کہا:

"چونکہ میری پارٹی نے اسلام کیخلاف مہم چلا رکھی ہے اسلئے میں پارٹی سے اپنی سیاسی وابستگی ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔

میناروں پر پابندی کے مطالبے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں تیس سال سے ایک ایسی پارٹی سے کیسے وابستہ رہا جو مسلمانوں کے حوالے سے متعصبارویہ رکھتی ہے، سوئٹزر لینڈ حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے شعائر پر عمل کرنے سے روکے، آج ضرورت تو اس بات کی تھی کہ سوئٹزر لینڈ میں زیادہ سے زیادہ مساجد ہوں، لیکن اس کے برخلاف سوئٹزر لینڈ میں میناروں پر پابندی اسلام کے خلاف تعصب اور مسلمانوں کا گھیراؤ کرنے کے مترادف ہے، آج میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اسلام میں مجھے اُن تمام سوالات کا جواب مل گیا جو بائبل میں نہیں مل سکا۔ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اسلام میں مجھے اُن تمام سوالات کے جواب مل گئے جو مُجھے بائیبل میں نہیں مل سکے۔

اسلام کی حقانیت کے مظہر یہ الفاظ سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی کا مطالبہ کرنے والی سیاسی جماعت سوئس پیپلز پارٹی سے وابستہ رہنے والے ڈینئل اسٹریچ کے ہیں، جو کچھ عرصہ قبل تک ایک پکے عیسائی کی طرح باقاعدگی سے بائیبل کا مطالعہ کرتے اور پابندی سے چرچ جاتے تھے، لیکن اب وہ قرآن پڑھتے ہیں اور نماز کیلئے پانچ وقت مسجد میں جاتے ہیں۔

ڈینیل اسٹریچ آج کل سول کنزرویٹو ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے نئی سیاسی جماعت بنانے کی تیاری بھی کر رہے ہیں، واضح رہے کہ ڈینئل اسٹریچ ایک سیاستدان ہونے کے علاوہ سوئس فوج میں انسٹرکٹر بھی ہیں، ان کے مسلمان ہونے کے اعلان کی وجہ سے سوئٹزرلینڈ میں بعض حلقے اس بات پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایک نومسلم کا فوج میں انسٹرکٹر کے طور پر کام کرنا خطرناک ہو سکتا ہے، وہ امریکی فوجی اڈے فورٹ ہڈ میں میجر ندال کی فائرنگ کا حوالہ دیتے ہیں، سوئس فوج میں ڈینئل اسٹریچ کا بطور انسٹرکٹر کام کرنا سیکورٹی رسک قرار دیا جارہا ہے تاہم فوج کے ترجمان نے اس کو بے ہودہ الزام قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سوئس فوج مذہبی تعصب سے پاک ہے۔

ڈینئل اسٹریچ کا کہنا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ سوئس قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ملک اور قوم کا وفادار ہوں۔ نہ تو قوم میں مذہب اختیار کرنے کی ممانعت ہے اور نہ ہی مذہب قوم اور ملک سے وفاداری سے روکتا ہے۔ بلکہ اسلام تو مسلمانوں کو ملک اور حکمران سے وفاداری کی تاکید کرتا ہے۔

نر بہادور

ایک نیپالی جو اسلام کے نُور سے نہا گیا

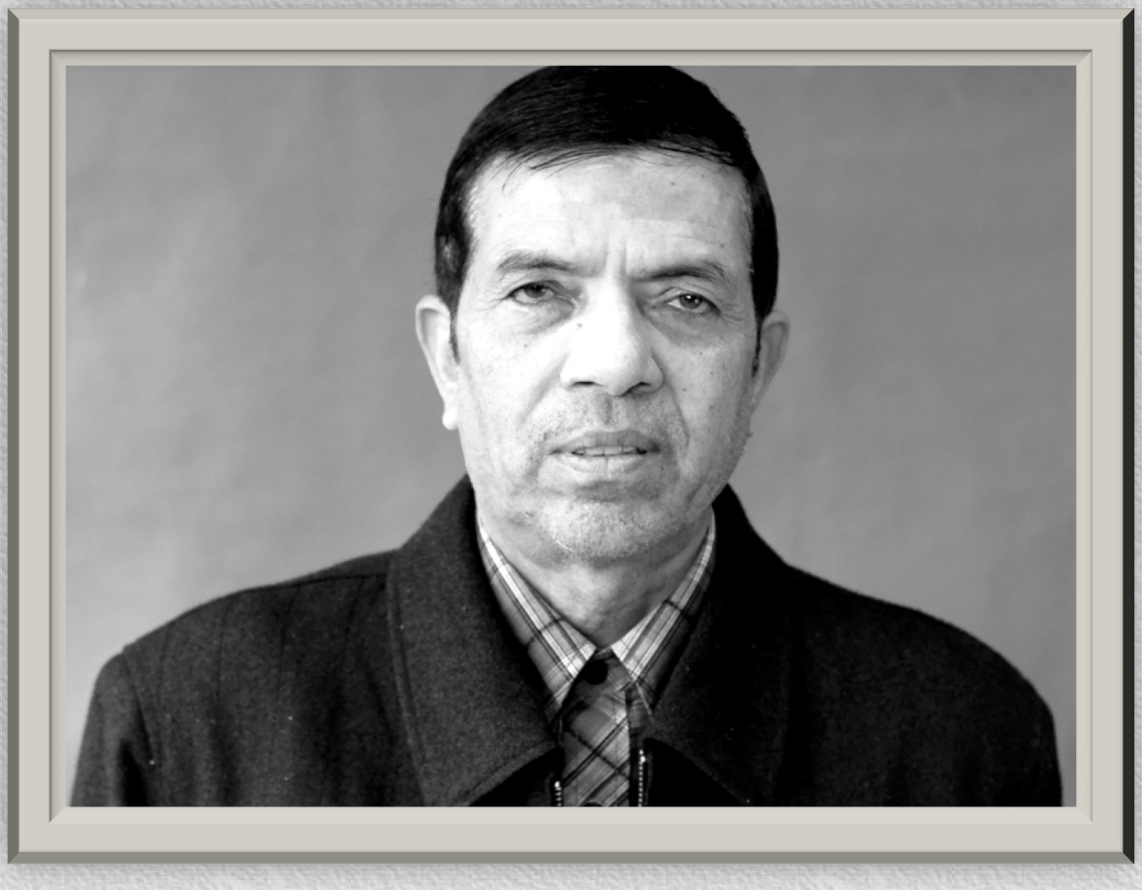

میں نیپال کے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرے خاندان والے نچلی ذات کے ہندو تھے۔ جب میں اسکول جانے لگا تو مجھے حیرت ہونے لگی کہ جن کھانے پینے کی چیزوں کو برہمن ذات کے بچے چھوتے یا کھاتے تھے۔ ہم نچلی ذات کے ہندو اُن چیزوں کو نہیں چھو سکتے تھے۔۔ ہمارے سامنے وہ اشیأ علیحدہ سے رکھ دی جاتی تھیں۔ میرے چھوٹے سے ذہن سے یہ بات برداشت نہیں ہوتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ آخر یہ تفریق کیوں ہے ؟ کیا بھگوان نے ایک جیسے انسانوں میں درجہ بندی کر دی ہے ؟ میری سوچوں نے مجھے ہندو مذہب سے باغی بنانا شروع کر دیا۔ میں اور میرے ماں باپ جب برہمن گھروں میں جاتے تو ہمیں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم کھڑے کھڑے کام ختم کر کے واپس لوٹ آتے تھے۔

میری ہندوازم سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اِس مذہب میں ہر روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا تھا جو میرے لئے ایک مضحکہ خیز بات تھی۔ ہمیں تہوار کی مناسبت سے کپڑے اور کھانے پینے کی اشیأ بھی خریدنا پڑتی جو ہم نچلی ذات کے ہندوؤں

کیلئے محدود وسائل کی وجہ سے بہت مشکل ہوتی تھی۔ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ہمیں برہمن ساہوکاروں سے سود پر اُدھار لینا پڑتا جو کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ اُدھار کے بدلے میں نچلی ذات کے ہندوؤں کو یہ ساہوکار اپنا غلام بنا لیتے تھے اور پھر اُن سے جو چاہتے کام لیتے تھے۔

زندگی کے نشیب و فراز میں، میں کچھ پڑھ لکھ گیا تو میرا چچا مجھے روزگار کیلئے قطر لے آیا۔ میں چار سال تک قطر میں رہا، اِس دوران میرے چچا نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد چچا کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ مُجھے کبھی کبھی اسلام کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ اُن کی باتیں سُن کر مجھے اسلام سے دلچسپی ہونے لگی۔ چنانچہ میں جب فارغ ہوتا تو ٹیلی ویژن پر اسلامی چینلز کے پروگرام دیکھنے لگتا۔ اسلام میں انسانوں کی ذات کی نسبت سے کوئی درجہ بندی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اونچا مقام انسان کو اپنے دینی و دنیاوی علوم اور اللہ کی عبادتوں سے ملتا ہے۔ اِس میں ذات پات کی کوئی قید نہیں ہے اور اسلام میں ذاتیں اور قبیلے محض پہچان کیلئے ہیں۔ اب اسلام میرے وجود میں سما چکا تھا اور میں ہندوازم سے مکمل طور پر بیزار ہو چکا تھا۔ میں قبولِ اسلام کیلئے اپنے مسلمان ساتھیوں سے بات چیت کرتا رہتا تھا آخر ایک دن میرے ایک مسلمان ساتھی نے مجھے اسلامک سینٹر "آئی پی سی" پہنچا دیا۔ اسلامک سینٹر میں مجھے اسلام کے بارے میں بتایا گیا اور رمضان المبارک 2014ء میں یہیں پر مجھے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اپنے لئے اسلامی نام "محمد نور" پسند کیا اور الحمدوللہ میں جو کبھی نچلی ذات کا ہندو تھا۔ آج محمد نور کہلاتا ہوں اور اسلام میں میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔ جب اللہ، نبی ﷺ اور قُرآن ایک تو پھر درجہ بندی کیسی؟

جب میں نے اسلام قبول کر لیا تو اپنی بیوی کو بتایا اور اُسے اسلام کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا، جس کا مجھے علم تھا۔ میری بیوی نے میری دعوت پر اسلام قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی۔ میں نے اسلام کی دعوت اپنے والدین کو بھی دی اور میں پر اُمید ہوں کہ وہ بھی جلد اسلام قبول کر لیں گے۔ میری اولاد میں دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں بڑی بیٹی سولہ سال کی ہے اور وہ نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اُمید ہے کہ وہ بھی جلد اسلام قبول کر لے گی۔ میرے دوسرے بچے بھی سنِ بلوغت پر پہنچ کر اسلام لے آئیں گے۔

میری خواہش ہے کہ میں اسلامی تعلیمات حاصل کر کے مبلغ بنوں اور اللہ کا یہ پیغام اُن لوگوں تک پہنچاؤں جو ابھی تک گمراہی

کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

میری مسلمان بہن بھائیوں سے گذارش ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے اچھا دین ہے۔ آپ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو کر بھی اس نعمت سے اس قدر دور کیوں ہیں؟ اگر آپ اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہوتے تو اس قدر بے فکری کی زندگی نہ گذارتے۔

خدارا! اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کر کے اسے دنیا میں پھیلائیں اور اپنی زندگی کو اسلام کے تابع بنائیں تاکہ وہ انعام (جنت) جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی بندگی کے صلہ میں تیار کیا ہے اُسے پا سکیں۔ میں ہر مسلمان کیلئے اللہ کی جنت کی دُعا کرتا ہوں۔ آمین۔

ماکزینس بٹے

اسلام کی مخالفت اسلام کی قبولیت بن گئی

"ممکن ہے کہ میرے اسلام قبول کرنے کے عمل سے میرے حلقۂ انتخاب میں بہت سے ووٹرز ناراض ہو جائیں لیکن میں نے اسلام قُرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد قبول کیا ہے اور میں اِسے کسی بھی قیمت پر ترک نہیں کرونگا اور اپنی زندگی کو عام مسلمانوں کی طرح اور تبلیغ میں گذاروں گا"

یہ الفاظ ہمارے نو مسلم بھائی ماکزینس بٹے کے ہیں جو اُنہوں نے ایک عالمی جریدے "ڈیپلومیٹ" کے رپورٹر سے بات چیت کرتے ہوئے کہے۔

ماکزینس بٹے کہتے ہیں کہ میری پارٹی "نیشنل فرنٹ" کا منشور غریب طبقے کے افراد کی فلاح کرنا ہے۔ نیشنل فرنٹ اپنے مقاصد سے ہٹ کر فرانس میں برقعہ و نقاب پر پابندی کے علاوہ مسلمانوں کا داخلہ بند کرانے کیلئے تحریک چلا رہی ہے۔ ماکزینس بٹے بھی اِس تحریک میں پیش پیش تھے پھر اللہ تعالی نے اس کو راہِ ہدایت دکھادی اور اِس نے سوچا کہ میں اُن لوگوں کے مذہبی عقائد جاننے کی کوشش کروں کہ جن کے خلاف ہم کمربستہ ہیں۔ پھر اُنہوں نے قُرآن کا مطالعہ شروع کیا اور دیکھا

کہ قُرآن میں تو غریبوں کو بڑے حقوق دیئے گئے ہیں اور قُرآن میں سود کو حرام قرار دیکر مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے۔اُس نے سوچا کہ یہ تو بالکل میری پارٹی کا منشور ہے اور اللہ نے بھی اُس کے دل پر صراطِ مستقیم کی روشنی ڈال دی۔ وہ جتنا سوچتا جاتا تھا یہ روشنی اتنا ہی اُس کے دل میں اترتی جاتی تھی۔ آخر کار اُس نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اِس دینِ حق کو اپنا لینا چاہیئے۔ ماکزینس بٹے نے خود ہی اپنی خواہش کا اظہار کر کے مسلم سینٹر جا کر اسلام قبول کر لیا۔اُنہوں نے اپنی پارٹی کے رہنماؤں سے بھی اپیل کی کہ ہماری پارٹی کا مشن اسلامی تعلیمات سے قریب تر ہے۔اِس لئے پارٹی منشور پر عمل اور مشن کو آگے بڑھانے کیلئے آپ کو بھی اسلام قبول کر لینا چاہیئے۔پارٹی میں اُن کے اسلام قبول کرنے اور انکی دعوتِ حق کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

نیشنل فرنٹ نے فوری ایکشن لیتے ہوئے ماکزینس بٹے کی پارٹی کی علاقائی رُکنیت معطل کر دی ہے۔ یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیئے کہ نیشنل فرنٹ کو فرانس میں امیگریشن مخالف اور اسلام دشمن پارٹی کے طور پر جانا جاتا ہے۔

2014ء کے شروع میں جب الیکشن مہم جاری تھی اُس وقت ماکزینس بٹے نے اسلام قبول کیا تھا اور اسلام دشمن مخالفت کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ووٹرز کو اسلامی عقائد کے بارے میں بتائیں گے۔

فرانس میں اس سال اپریل میں میونسپل الیکشن ہوئے تھے جن میں نیشنل فرنٹ کو اپنے امیگریشن اور اسلام مخالف نظریات اور رویئے کی بنا پر زبردست پذیرائی ملی۔ اور اُنہوں نے نوے کی دہائی میں اپنی ریکارڈ فتح سے دوگنی کامیابی حاصل کی۔ نیشنل فرنٹ نے گیارہ ٹاؤنز اور چودہ سو سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔

ماکزینس بٹے پارٹی رکنیت معطل ہونے کے باوجود اب بھی مقامی کونسلر کے عہدے پر ہیں۔ نیشنل فرنٹ کے علاقائی

سیکرٹری "جورڈن برڈیلا" نے آئی بی ٹائمز یوکے کے رپورٹر سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مذہب ہر کسی کا ذاتی معاملہ ہے مگر اسے سیاسی سرگرمیوں میں نہیں لانا چاہیئے۔ ماکزینس بٹے نے جو تبلیغی وڈیو پارٹی اراکین کو بھیجی ہے اُسکا یہ اقدام ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔

ماکزینس بٹے ایک کیتھولک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے بائیبل کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے مگر بائیبل کی تعلیمات غیر حقیقی اور نقائص سے بھرپور ہیں جبکہ قُرآن کی تعلیمات سچائی اور نرم رویئے کا درس دیتی ہیں۔

ماکزینس بٹے اپنی انتخابی مہم کے دوران

نیشنل فرنٹ پارٹی کے ترجمان کا کہنا ہے کہ ماکزینس بٹے کی دعوتِ اسلام کو قبول کرنا پارٹی نظریے کی موت ہے جو ہمیں کسی طور پر بھی گوارا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ دنیا میں اسلام کا بول بالا کرے۔ آمین، ثم آمین

سائمن کولیز

سعودی عرب میں برطانوی سفیر نے اسلام قبول کر لیا

سائمن کولیز 23 فروری 1956ء کو برطانیہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم کنگ ایڈورڈ سیون اسکول شِیفیلڈ سے حاصل کی، اور اعلیٰ تعلیم مسیحی کالج کیمبرج سے 1973ء میں مکمل کی۔ 1978ء میں اُنہوں نے تعلقات امورِ خاجہ میں ملازمت کر لی۔

1981ء میں پہلی بار سائمن کولیز کو بحرین میں سیکنڈ سیکریٹری کے طور پر تعینات کیا گیا۔ وہ 1984ء تک وہاں خدمات سر انجام دیتے رہے۔ 1984ء سے 1986ء تک اُنہوں نے غیر ملکی مشترکہ امور کے دفتر میں خبروں کے محکمہ میں ترجمان کے طور پر کام کیا۔ 1986ء میں اُنہوں نے عارضی طور پر سلطنتِ برطانیہ کے مشن کیلئے نیویارک میں کام کیا۔ 1987ء سے 1988 تک وہ ساؤتھ ایشین ڈیپارٹمنٹ کے انڈین سیکشن میں سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1988ء سے 1990 تک وہ تیونس میں برطانوی سفارت خانے میں نائب سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1990ء اور 1991ء کے دوران اُنہوں نے گلف وار ایمرجنسی یونٹ میں کام کیا۔

سائمن کولیز نے سفارتکاری کے میدان میں اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ 1991ء سے 1994ء تک نیو دہلی انڈیا میں فرسٹ

سیکریٹری کے طور پر سفارت کار کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ 1994ء میں اُنہیں شمال مشرق افریقی ڈیپارٹمنٹ کا نائب سربراہ مقرر کیا گیا وہ یہ خدمات 1996ء تک سرانجام دیتے رہے۔ 1996ء میں اُنہیں اُردن میں ڈپٹی سیکرٹری متعین کیا گیا۔ وہ اِس عُہدے پر دار لحکومت عمان سٹی میں 1999ء تک رہے۔ 1999ء میں اُن کو برٹش پیٹرولیم میں بھیج دیا گیا۔ یاد رہے کہ برٹش پیٹرولیم دُنیا کی سات بڑی کمنیوں میں سے ایک ہے۔ وہ ایک سال تک اِس عہدے پر کام کرتے رہے۔

مُحترم سائمن کولیز اور انکی بیوی کی یہ تصویر پہلی بار سعودی رائٹر فوزیہ البکر نے میڈیا میں شائع کی۔

سائمن کولیز 2000ء میں کونسل جنرل منتخب ہو کر دبئ متحدہ عرب امارات چلے گئے اور 2004ء تک وہاں پر رہے۔ وہاں سے اُنہیں کونسل جنرل کے طور پر بصرہ عراق بھیج دیا گیا، عراق میں وہ ایک سال تک رہے۔ 2005ء سے 2007ء تک وہ قطر میں برطانوی سفیر رہے اور پھر اُنہیں شام بھیج دیا گیا۔ وہ شام میں پانچ سال تک برطانوی سفیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اِسی دوران 2011ء میں اُنہوں نے اسلام قبول کیا اور شادی کی۔ اُن کی بیوی ہُدیٰ مجارکیش شامی نژاد ہیں اور اُنہوں نے بھی سائمن کولیز کے ساتھ ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔

2012ء میں سیاسی وجوہات کی بنا پر برطانیہ نے شام سے سفارتی عملے کو واپس بلا لیا اور سائمن کولیز کو عراق بھیج دیا گیا۔ وہ ستمبر 2014 تک عراق میں برطانوی سفیر کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ سائمن کولیز ملازمت کے دوران چونکہ زیادہ وقت عرب ممالک میں رہے، اِس لئے وہ عربی اچھی طرح لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے تھے۔ تین فروری 2015ء کو اُنہیں

سعودی عرب میں برطانوی سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اسی سال وہ اپنی بیوی سمیت حج ادا کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ میڈیا پر یہ خبر پھیلی تو اُنہوں نے اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اور اُن کی بیوی پانچ سال قبل اسلام قبول کر چکے ہیں۔ سائمن کولیز پہلے برطانوی سفیر ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر کے فریضۂ حج ادا کیا۔

سائمن کولیز سعودی فرمانروا شاہ سلیمان سے مصافحہ کرتے ہوئے

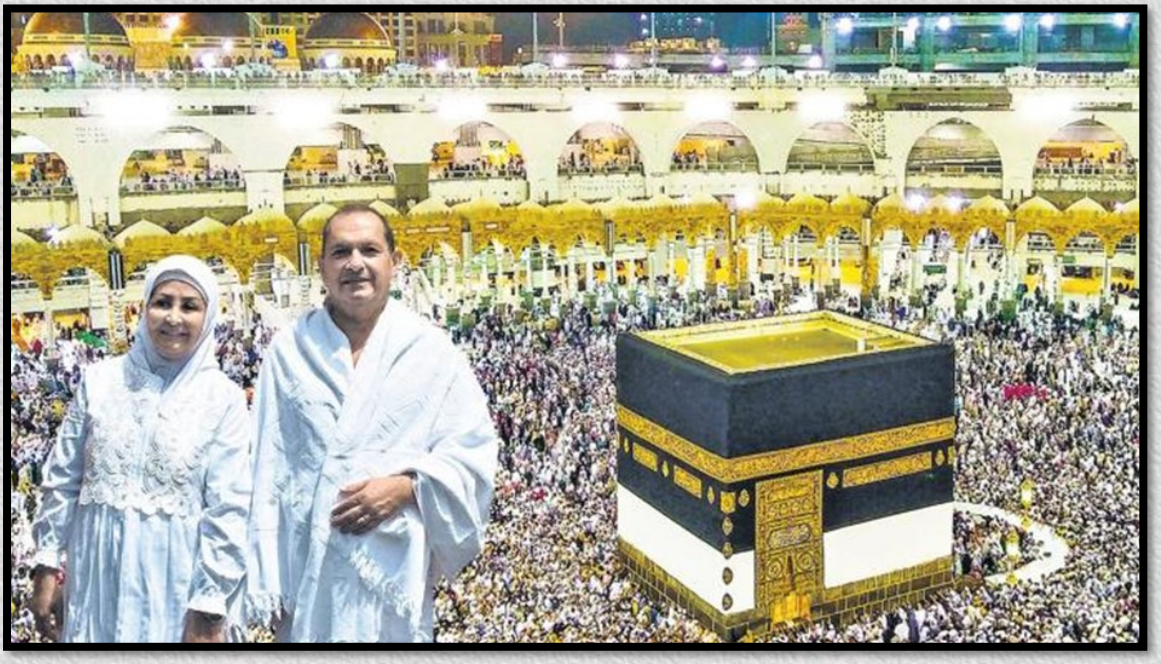

سائمن کولیز اور اُن کی بیوی ہُدیٰ مجارکیش حج کے موقع پر احرام پہنے ہوئے

سائمن کولیز کہتے ہیں کہ میں نے عرب ممالک میں رہتے ہوئے تیس برس تک اسلامی معاشرے کا جائزہ لیا اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ یہی سچائی کا رستہ ہے، چنانچہ میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ سائمن کولیز کے اسلام قبول کرنے کی خبر میڈیا میں آئی تو دُنیا بھر سے مبارکباد کے پیغام آئے اور بہت سے لوگوں نے تو اُنہیں حاجی سائمن کولیز کے نام سے مخاطب کیا۔ ہمارا کوئی سفیر ایسا کرتا تو یہ بات مہینوں بریکنگ نیوز بنی رہتی مگر برطانیہ میں ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ اِس خبر کو ایک عام سی خبر کے طور پر مناسب انداز میں پیش کیا گیا۔

سائمن کولیز کے قبولِ اسلام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو کتنا پھیلایا اور اِس کی حفاظت فرمائی ہے۔ جس دل میں اسلام کیلئے ذرا سی بھی کشش ہوتی ہے۔ تو وہ اسلام کی جانب کھچتا چلا آتا ہے۔ اسلام واحد دین ہے کہ جس کو قبول کرنیوالوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

پرویز مسیح

آخر کار اسلام ہی میری منزل ٹھہری

میں 1964ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ میرے والدین پروٹیسٹینٹ عیسائی تھے۔ اُنہوں نے میرا نام "پرویز مسیح" رکھا۔ سیالکوٹ پنجاب کا شہر ہے جو کھیلوں کا سامان بنانے کے سبب مشہور ہے۔ میرے خاندان کے سارے لوگ اسی خطے میں آباد ہیں۔ ہم نو بہن بھائی ہیں اور میں تیسرے نمبر پر ہوں۔ میں نے جوانی تک کی زیادہ تر بہاریں سیالکوٹ میں ہی گُذاریں اور میں نے ابتدائی تعلیم مشنری اسکول ایبٹ آباد میں حاصل کی۔ گھریلو حالات کے سبب میں پرائمری کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ گھریلو حالات کے پیشِ نظر مُجھے درزی کا کام سیکھنا پڑا۔ چار سال تک میں نے محنت سے مکمل کام سیکھ لیا۔ 1983ء میں اُنیس سال کی عُمر میں میری شادی کر دی گئی۔

پاکستان میں عیسائی زیادہ تر کیتھولک ہیں اور باقی پروٹیسٹینٹ ہیں۔ کیتھولک حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور بی بی مریم دونوں کو مانتے ہیں جبکہ پروٹیسٹینٹ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو ماننے والے ہیں۔ اکثریت کی وجہ سے زیادہ چرچ کیتھولک عیسائیوں کے ہیں، جبکہ پروٹیسٹینٹ عقیدے والوں کے چرچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اِس لئے پروٹیسٹینٹ عقیدے کے لوگوں کی اکثریت عبادات اپنے گھروں میں ہی کرتی ہے۔

پروٹیسٹینٹ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ انہیں زندگی میں کم از کم ایک بار "بپتسمہ" کے عمل سے ضرور گزرنا چاہئیے، تاکہ وہ گناہوں سے پاک ہو سکے۔ اِس عمل میں سے گذرنے والے شخص کو ایک خاص طریقے سے بہتے ہوئے یا شفاف پانی میں ڈبویا جاتا ہے اور یہ عمل تین بار کیا جاتا ہے۔ اِس طرح اُن کے پرانے گناہ دُھل جاتے ہیں اور وہ شخص پاک ہو کر اپنی باقی زندگی کو بہتر طریقے سے گذارنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے بھی یہ عمل 1982ء میں کیا تھا۔ کیتھولک عیسائیت میں یہ عمل کرنے کیلئے نوازئیدہ بچے کو گود میں لیکر چھوا جاتا ہے۔۔

اِس وقت 2014ء میں جب میں اپنی کہانی بیان کر رہا ہوں۔ میری عُمر پچاس برس ہے۔ اکیس برس قبل میں روزگار کیلئے ریاض سعودی عرب گیا۔ وہاں پر میرے سارے ساتھی مُسلمان تھے۔ اُن کی صُحبت میں رہ کر میں بھی کوئی کام شروع کرنے سے قبل بسم اللہ پڑھ لیتا تھا۔ پھر کبھی کبھار اپنے ساتھیوں کیساتھ نمازِ جمعہ کیلئے مسجد بھی چلا جاتا تھا۔ مگر مجھے بسم اللہ کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا، میں بس اُن کے عمل کو دُہراتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں مُجھے اِس عمل کے کرنے سے مزا اور سکون ملتا تھا۔ عیسائیوں میں تو اس طرح کی عبادات کو کوئی تصور نہیں ہے، ہفتے میں ایک بار چرچ جانا بھی اُن کو گراں گذرتا ہے۔ اسی طرح دن گذرتے گئے اور پھر رمضان کا مہینہ آگیا۔ مُجھے بھی اشتیاق ہوا اور میں نے اپنے ساتھیوں کیساتھ پورے روزے رکھے۔

سعودی عرب میں میرا قیام دو سال تک رہا، اِس دوران مُجھے نہ کوئی عیسائیوں کی عبادت گاہ نظر آئی اور نہ ہی کسی ہم مذہب سے مُلاقات ہوئی۔ میں اُس ماحول میں اسلام کے قریب ہوتا چلا گیا۔ میرے کفیل مساعد محمد المدلج بہت اچھے انسان تھے۔ جب بھی مُلاقات ہوتی، وہ بڑے شفقت سے پیش آتے تھے۔ مُجھے اپنے ساتھ گاڑی میں گھمانے لے جاتے، اکثر وہ مُجھے اسلام قبول کرنے کیلئے کہتے تھے۔ وہ مُجھے کہتے تھے: پرویز! تم اچھے آدمی ہو، اسلام قبول کر لو، میں ہر مشکل میں تمہاری مدد کروں گا۔ شائد ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا، اسی لئے میں ذہن میں یہ خیال آتا تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کو مدد کا لالچ دیکر مُسلمان بنا لیتے ہیں۔ یہاں مُسلمانوں کی صُحبت میں رہ کر میرے اندر اسلام کی کرن پھوٹ پڑی تھی۔ میں گھنٹوں بیٹھا سوچتا رہتا تھا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ پھر مُجھے کویت میں نوکری مِل گئی تو میں وہاں چلا گیا۔ کویت میں بھی ماحول کچھ ایسا ہی تھا، میرے تمام ساتھی مسلمان تھے اور وہ بھی مُجھے اکثر اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے۔

اسلامی ماحول کا اثر تھا کہ مُجھے اسلامی اقدار اچھی لگنے لگیں اور اپنی عبادات کے بارے میں منفی سوچ پیدا ہونے لگی۔ مُجھے

نہیں معلوم کہ مسلمانوں سے اس قدر قریب رہ کر میرے سینے کی کھڑکی کیوں نہ کُھل سکی کہ جس سے اسلام میرے وجود میں سما جاتا۔ میں اب بھی اسلام کے بارے میں مطمئن نہیں تھا۔ دوستوں سے اسلام کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی، پھر میں نے اسلام کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ایک دن ایسا آیا کہ دل تو چاہتا تھا کہ میں فوراً اسلام قبول کر لوں، مگر جب مُجھے اپنے والدین، بہن بھائی اور بیوی بچوں کا خیال آتا تو تبدیلی مذہب جنون ٹھنڈا پڑ جاتا، یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اتنے سارے رشتوں کے بندھن توڑ کر تن تنہا ایک نئے مذہب سے وابستہ ہو جاتا۔

کویت میں میرے شب و روز اسی کشمکش میں گُذرتے رہے اور 2013ء آ گیا۔ مُجھے گردے میں شدید تکلیف ہوئی، ڈاکٹر کے پاس گیا تو اُس نے معائنہ کر کے بتایا کہ صورتحال بڑی نازک ہے مُجھے فوری آپریشن کروانا ہو گا۔ چنانچہ چھ جون کو مُجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا اور بارہ جون کو آپریشن ہوا۔ یہ آٹھ دس روز جو میں نے ہسپتال میں گذارے۔ میں بیڈ پر لیٹا سوچتا رہا کہ میں اب عُمر رسیدہ ہو گیا ہوں، کتنا اچھا ہوتا کہ میں پہلے ہی اسلام قبول کر لیتا۔ میرے بچوں دو بیٹوں اور دو بیٹیوں نے مُجھ سے پہلے یہ سعادت حاصل کر لی اور میں جن رشتوں کے ٹوٹنے کے ڈر سے آج تک سعادت سے محروم رہا، اُنہی رشتوں کے بیچ ایک دیوار حائل ہو چکی تھی۔ میں کتنا بدنصیب تھا کہ ابھی تک بے دین اور بے یقینی میں مبتلا تھا مگر میرے بچے رشتوں کی دیوار پھلانگ کر دینِ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

میری بڑی بیٹی کی شادی مسلمان گھرانے میں ہو چکی تھی اور وہ اپنی زندگی سے خوش تھی۔ میری چھوٹی بیٹی جامعہ میں اسلامی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میرا ایک بیٹا بھی اسلامی علوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اُس کا کہنا تھا کہ دُنیاداری سے پہلے اسلام سے آشنائی ضروری ہے۔ اسکول میں دی جانیوالی لازمی اسلامی تعلیم نے میرے بچوں کو دین دار بنا دیا تھا۔ ہمارا گھر جِس محلے میں تھا، وہاں سب مسلمان رہتے تھے، اُنہوں نے کبھی ہمیں تنگ نہیں کیا بلکہ خوشی اور غم میں شریک رہتے تھے۔ سب سے بڑھ کر محلے میں ایک معلم قاری ریاض احمد تھے، اُنہوں نے میرے بچوں کا بڑا خیال رکھا۔ میری بیوی انتقال کر چکی تھی، اُنہوں نے میرے بچوں سے کہا کہ وہ چاہیں اُن کے پاس آ جائیں وہ اُن کے اخراجات برداشت کر لیں گے۔

جب بچوں کے اسلام لانے کی خبر مجھ تک پہنچی، تو مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ میں فون پر اُنہیں کوستا رہتا اور یہاں تک کہ بڑے بیٹے کو

جان سے مار ڈالنے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ مجھ میں جھنجلاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی، میں ہر وقت کُڑھتا رہتا تھا اور پھر کئی کئی مہینے اپنے بچوں سے بات تک نہ کرتا تھا۔ رشتوں کی جس جمع تفریق نے مجھے ابھی تک اسلام سے دور رکھا ہوا تھا۔ وہی دیوار آج ہمارے درمیان کھڑی تھی، جس کے ایک طرف میں اور میرے والدین اور دوسری طرف بچے کھڑے تھے۔

آج میں بستر پر پڑا سوچوں میں گم تھا اور میری آنکھوں میں آنسو ٹپک رہے تھے۔ ایک دن میں اِس خوف سے ڈر گیا تھا کہ اگر میں نے اسلام قبول کر لیا تو میرے بیوی بچے مُجھ سے دور ہو جائیں گے، مگر یہی لمحہ جب اُن کی زندگی میں آیا تو اُنہوں نے اِس خوف کی ذرا پرواہ نہیں کی، اور فوراً اسلام قبول کر لیا۔ میں اب تک مسجد جاتا اور اسلامی درس میں شریک ہوتا تھا مگر میری بدقسمتی کہ ابتک تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھا۔

میرے ذہن میں اسلامی تعلیمات گردش کرنے لگیں، اچانک مُجھے رسُول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب کا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ اسلام ہی سچا دین ہے مگر اس خیال سے کہ لوگ کیا کہیں گے، وہ بے دین ہی مر گئے۔ ایک بجلی سی میرے بدن میں کوند گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا ہسپتال سے باہر نکلتے ہی اسلام قبول کر لوں گا۔

میں ہسپتال سے فارغ ہو کر رہائش گاہ پر پہنچا تو اپنے بیٹے کو فون کیا اور کہا: بیٹا! تم ہر روز فون پر میری خریت معلوم کرتے تھے ۔ دو سال پہلے تم نے اسلام قبول کیا، مگر کبھی بھی مجھے دین کی دعوت نہیں دی۔ کیا لوگ تمہیں طعنے نہیں دیں گے کہ تم ایک عیسائی کی اولاد ہو۔ میں نے بھی اب اسلام لانے کا فیصلہ کر لیا ہے، اب تم ہی مجھے رستہ بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہو گا؟ میری باتیں سُن کر بیٹا بہت رویا اور پھر فون پر ہی کلمہ پڑھوایا۔

میرا بیٹا بولا: ابا! اب تم مسلمان ہو چکے ہو اِس لئے کسی اسلامی سینٹر جاؤ اور اسلامی تعلیمات حاصل کرو۔ پانچ جولائی کو جمعہ کے روز میں اسلامک سینٹر کویت سٹی پہنچا اور اپنے اسلام لانے سے اُنہیں آگاہ کیا، اُنہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے نمازِ جمعہ سے دو گھنٹے قبل بلایا۔ ان مراحل سے گُذرنے کے بعد مجھے والدین کی یاد آئی۔ میں ناراضگی کے ڈر سے اُنہیں کچھ بتانے کا حوصلہ نہ کر سکا، ہاں اپنی ایک بہن کو اِس بارے میں بتا دیا۔ رشتہ داروں کے بارے میں ایک خوف سا دل میں ہے کہ اُن کو معلوم ہو گا تو ہنگامہ کریں گے۔ مگر اسلام لانے کا سوچ کر حوصلہ ہوتا ہے اور سوچتا ہوں کہ پاکستان جا کر اُنہیں بھی اسلام کی دعوت دوں

گا اور باقی آنے والے حالات کو اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔

اسلام لا کر میں اب مسلمانوں میں گھل مل گیا ہوں اور میرے تمام اندیشے غلط ثابت ہوئے کہ مسلمان بڑے سخت مزاج ہوتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان مزاج کے نرم اور روایات و اقدار پر سختی سے قائم رہنے والے لوگ ہیں۔ ابھی نماز اور اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوا مگر نماز کیلئے مسجد ضرور جاتا ہوں اور توبہ و استغفار کرتا رہتا ہوں۔ والدین اور عزیز و اقارب کیلئے بھی دُعا گو ہوں کہ اُنہیں دینِ اسلام کی یہ دولت ملے۔ جہالت کا اندھیرا چھٹنے کے سبب خود کو ہلکا محسوس کرتا ہوں۔ اسلام لانے کے بعد الحمدوللہ میری زندگی میں برکتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اللہ مُجھے استقامت عطا فرمائے، میرے لئے دُعا ضرور کیجئیے گا۔

ورنر کلاون

سابق جرمن رُکنِ پارلیمنٹ کا قبولِ اسلام

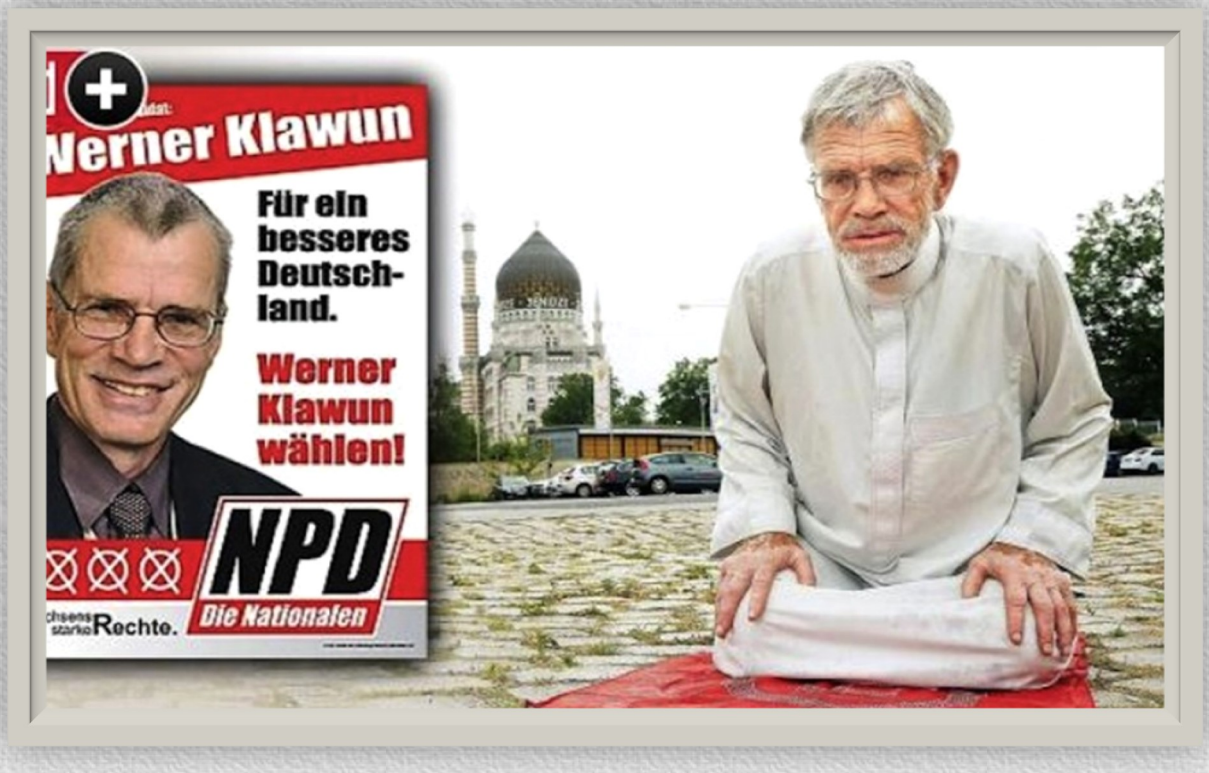

جرمن جریدے "ڈائی بِلڈ" نے 30 جولائی 2016ء کو یہ اہم خبر شائع کی:

"سابقہ جرمن رُکنِ پارلیمنٹ ورنر کلاون نے اسلام میں امن تلاش کر لیا"

روزنامہ "ٹوڈیز بریکنگ" نے اپنی 2 اگست 2016ء کی اشاعت میں لکھا:

"سابق انتہائی دائیں بازو کے رُکنِ پارلیمنٹ ورنر کلاون نے اسلام قبول کر لیا۔

ورنر کلاون جرمن ڈیموکریٹک پارٹی کے سینئر رُکن تھے۔ تقریباً پچاس سال تک وہ اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ وہ مشرقی جرمنی کے شہر "درسیدین" سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہیں سے اُنہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے اپنی پوری زندگی جرمن قوم پرستی میں گُذاری۔ اپنی سیاسی زندگی میں وہ ہمیشہ جرمنی میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کی مخالفت کرتے رہے۔ جرمن جریدے ڈائی بِلڈ کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے اُنہوں نے بتایا:

وہ مطالعہ کے بڑے شوقین ہیں، ایک روز وہ جرمن فلسفی اور شاعر "گوئٹے" کی کتاب "مشرقی دیوان" کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اُن کی نظر سے کچھ اشعار گذرے جن میں گوئٹے نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعریف کی تھی۔ ورنر کلاون سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جب گوئٹے جیسے عظیم شاعر نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعریف کی ہے تو اِس بات میں یقیناً سچائی چھپی ہوئی ہے۔ پھر میں نے ایک مسلمان عالمِ دین سے رابطہ کیا اور اسلام کے بارے میں جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے مُجھے بتایا کہ اگر میں اسلام کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں تو پھر مُجھے قُران اور اُس کی تفسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پھر اگر کچھ سوال تمہارے ذہن میں اُٹھیں تو پھر تم مُجھ سے جوابات کیلئے رابطہ کرنا تاکہ تمہارے شکوک و شبہات دور ہو جائیں۔

میں نے وقت ضائع کئے بغیر قُرآن کا نسخہ حاصل کیا اور مطالعہ شروع کر دیا۔ قُرآن کے مطالعہ نے میرے دل و دماغ کے تمام بند دریچے کھول دیئے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت نصیب فرمائی۔ پھر میں نے اللہ کی رضامندی سے 74 سال کی عُمر میں کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اپنے لئے میں نے اسلامی نام "ابراہیم" پسند کیا۔ مُجھے اسلامی لباس شلوار قمیض اور عربی جُبہ بہت پسند ہیں۔

ڈائی بِلڈ کو انٹرویو دیتے وقت ابراہیم (ورنر کلاون) شلوار قمیض اور عربی جُبہ میں ملبوس تھے۔اسلام قبول کرنے کے بعد ابراہیم کلاون نے اپنی ساری توجہ مُسلم پناہ گزینوں کی راہنمائی کیلئے وقف کر دی۔ وہ کہتے ہیں کہ جرمن آئین کسی کو مُلک یا مذہب کی بُنیاد کی بناپر جرمنی میں قیام سے محروم نہیں کرتا۔وہ جرمنی میں قیام کے خواہشمند مسلمانوں کی راہنمائی کرتے ہیں کہ وہ کس طرح جرمنی میں اپنے قیام کو قانونی تحفظ دے سکتے ہیں۔ وہ اُنہیں رہائش اور جاب کے حصول کیلئے بھی معاونت فراہم کرتے ہیں۔

ابراہیم کلاون کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں کہ جس نے اُنہیں اِس عُمر میں ہدایت کی روشنی عطا فرمائی۔ میں نے قُرآن کے مفہوم اور تفسیر کو پڑھ کر یہ سمجھ لیا ہے کہ بیشک گناہوں سے نجات اور آخرت کے انعام کیلئے اسلام ہی سیدھا راستہ ہے۔ میں نے اپنی سابقہ زندگی اور گناہوں سے توبہ کرلی ہے اور اب میں اپنا زیادہ وقت نمازِ پنجگانہ اور قُرآن کی تلاوت میں گذارتا ہوں اور باقی وقت شامی پناہ گزینوں کی خدمت کرنے میں صرف کر رہا ہوں۔

ابراہیم کلاون کہتے ہیں کہ اُنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی بیوی اور پانچ بچوں کو بھی اسلام کی حقانیت کے مطالعہ کی دعوت دی جو اُنہوں نے ٹھکرادی، لہذا میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اُن سے اپنا تعلق ختم کرلیا ہے۔

ابراہیم کلاون کے مطابق جرمنی میں دائیں اور بائیں بازو کی تمام جماعتیں کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کی جرمنی میں آمد کی

مخالف ہیں اور ایک جرمن تنظیم "پیگیڈا" تو مسلمان پناہ گزینوں کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔ جرمن میڈیا نے اُنکے قبولِ اسلام کے واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی

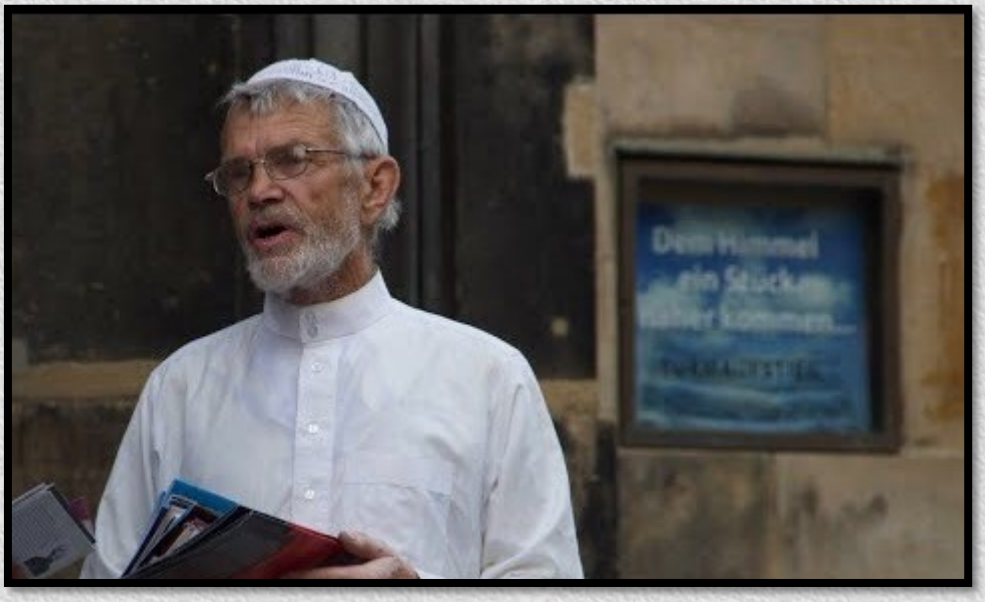

ابراہیم کلاون تمام دُشواریوں کے باوجود اپنے ساتھیوں سے مل کر جرمنی آنیوالے مسلمانوں کیلئے ماحول کو ساز گار بنا رہے ہیں۔ جرمن میڈیا کے مطابق شام سے آنیوالے کئی خاندان ابراہیم کلاون کے گھر قیام وطعام کی سہولت سے مُستفید ہو رہے ہیں۔ ابراہیم کلاون کا کہنا ہے کہ وہ اپنی تمام رقم پناہگزین مسلمانوں پر خرچ کر دیں گے۔

اپنے انٹرویو میں اُنہوں نے کہا: یورپی ممالک اور جرمن میڈیا یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمان انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں، جو کہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام امن کا پیغام دیتا ہے اور مسلمان کبھی بھی دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ماضی کے گناہوں اور اسلام مخالفت کا کفارہ جرمنی میں آنیوالے پناہگزینوں کی مدد کر کے ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اِس عظیم مقصد میں کامیابی عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

جوپال ایچان

ایک فلپائنی نو مسلم کی داستان

میرا تعلق ایک مذہبی اور رومن کیتھولک فیملی سے تھا۔ میں بھی بچپن ہی سے مذہبی سرگرمیوں میں بہت جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا۔ حتیٰ کہ میں نوجوانوں کے اس خاص گروہ کا ممبر بن گیا جو چرچ کی خدمت کے لیے مقرر تھے۔ ہمارے گروپ کے لیے "میری" کا ایک مخصوص بت تھا جس کی ہم بہت شوق سے پوجا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں بائیبل پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ بائیبل صرف ہمارے پیشوا پڑھتے اور ہم اسے سنتے تھے۔ کالج کی زندگی میں میرے ایک دوست نے مجھے دعوت دی کہ میں ان کے چرچ کا طریقہ عبادت دیکھوں۔ یہ چرچ پروٹیسٹنٹ تھا۔ ان کے ہاں میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں ہر فرد بائیبل پڑھ سکتا ہے اور یہ کہ بائیبل کی رو سے کسی قسم کے بت کی پوجا جائز نہیں ہے۔ اس تجربے نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں غور و خوض کے بعد کیتھولک چرچ چھوڑ کر پروٹیسٹنٹ میں شامل ہو گیا۔ میں اپنی فیملی میں پہلا پروٹیسٹنٹ تھا۔ آہستہ آہستہ میری پوری فیملی اس چرچ سے وابستہ ہو گئی۔ یہاں میں نے بائیبل پر پوری دسترس حاصل کی یہاں تک کہ میں ایک پادری کے طور بھی کام کر سکتا تھا۔ میں اسلام کے بارے میں بالکل کورا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ مسلمان ایک مذہب کا نام ہے۔ مجھے کبھی کسی مسلمان سے ملنے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ کالج میں چند اساتذہ مسلمان تھے لیکن وہ بھی محض نام کے مسلمان تھے ان کی اور ہماری معاشرت میں کوئی فرق نہ تھا۔ مجھے ذہنی طور پر مسلمانوں سے نفرت تھی کیونکہ ہمارے ملکی اخبارات اور ٹی وی ببانگ دہل مسلمانوں کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اس بات کا بار بار اعلان کیا جاتا کہ مسلمان دہشت گرد طبقہ ہے۔ ہمیں یہ نصیحت کی جاتی کہ ایک مسلمان کے سامنے سے نہ گزرو کیونکہ وہ بلا دریغ تمہیں قتل کر دے گا۔ اور یہ کہ مسلمان سے لین دین مت کرو کیونکہ بنیادی طور پر وہ بہت برے لوگ ہیں۔ کمپیوٹر سائنس میں بی ایس سی کرنے کے بعد مجھے اور میرے ایک دوست کو سعودی عرب کے ایک بینک میں کمپیوٹر انجینئر کی جاب مل گئی چنانچہ ہم دونوں سعودی عرب آ گئے۔ میں نہ صرف عربی زبان سے کورا تھا بلکہ مجھے اس سے نفرت بھی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس زبان کی بین الاقوامی طور پر کوئی اہمیت نہیں۔ اس لیے اس کا سیکھنا غیر ضروری ہے ویسے بھی بینک میں سب لوگ انگریزی جانتے تھے اس لیے عربی کی ضرورت ہی محسوس

نہ ہوئی۔ میں اور کچھ دوسرے فلپائنی ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ سعودی عرب کی طرز معاشرت میں کئی قسم کی پابندیاں تھیں اس کی وجہ سے ہم اپنی سعودی زندگی میں ایک گھٹن سی محسوس کر رہے تھے۔ میری زندگی میں روشنی کی پہلی کرن اُس وقت داخل ہوئی جب ایک دن میں نے دمام شہر سے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اس سے پندرہ ریال کرایہ طے کیا۔ لیکن سفر کے اختتام پر ٹیکسی ڈرائیور نے زیادہ کرائے پر اصرار کیا۔ اس بات پر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اسے کہا کہ تم پانچ وقت کی نماز پڑھنے کے باوجود اس طرح کی حرکت کرتے ہو؟ یہ سنتے ہی ٹیکسی ڈرائیور بالکل خاموش ہو گیا اور اس نے کہا مجھے صرف پندرہ ریال ہی دیں۔ میں نے اسے پندرہ ریال دیے اور وہ شرمندہ سا ہو کر خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ جب میں نے اس بات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ڈرائیور بہت نیک دل تھا اور اُس کے دل میں اپنے مذہب کی بہت وقعت تھی۔ اس کے بعد میری رائے تبدیل ہو گئی اور میں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ یہاں کے باشندے بنیادی طور پر اچھے لوگ ہیں۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کے بارے میں میری سوچ نرالی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ لوگ بتاتے نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ سورج کی پوجا کرتے ہیں اسی لیے میں اِنکو سورج نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات میں عبادت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ایک دن میں نے اپنے انچارج عبد اللہ العمری صاحب کی زبان سے عیسیٰ علیہ السّلام کا نام سُنا، تو میں حیران ہو گیا، اور فوراً انہیں ٹوکا کہ عیسیٰ تو ہمارے نبی ہیں آپ کیوں اُن کا نام لے رہے ہیں۔ عبد اللہ صاحب میری اس بات سے بالکل ناراض نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے بڑے دھیمے انداز میں مجھے بتایا کہ ہم مسلمان سب پیغمبروں کے ماننے والے ہیں اور انہوں نے نوح، ابراہیم، موسیٰ علیہم السلام کے نام لیے۔ اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کے مذاہب میں کوئی تعلق ضرور ہے۔ اب میں نے اسلام کے بارے میں چھان بین شروع کر دی کہ دیکھوں کہ یہ تعلق ہے کیا؟ میں مختلف بک سٹوروں پر گیا تاکہ اسلام پر کتب خرید سکوں۔ ایک بک سٹور پر مجھے ایک کتاب نظر آئی:

"Jesus not God, son of Merry"

میں نے یہ کتاب اور ایسی ہی چار اور کتابیں خرید لیں۔ ان کتابوں میں بائیبل کے بہت سے اقتباسات تھے۔ میں نے جلدی سے بائیبل نکالی تاکہ ان کا موازنہ کر سکوں۔ تمام اقتباس بالکل درست تھے اس سے میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ دو سال گزر گئے اس دوران میں نے مطالعہ جاری رکھا اور عرب تہذیب کا مطالعہ بھی۔ اتنے عرصہ میں کسی نے بھی مجھے اسلام قبول کرنے پر

مجبور نہ کیا اور نہ ہی کسی نے دعوت دی البتہ میرے ہر سوال کا بہت تسلی بخش جواب دیا جاتا۔ میں ایک تبلیغی مرکز بھی جانے لگا، وہاں بھی لوگ مجھ سے خندہ پیشانی سے ملتے لیکن کوئی بھی مجھے اسلام قبول کرنے کے لیے نہ کہتا۔ میں نے احمد دیدات کی ویڈیو بھی دیکھیں چونکہ میں خود بھی بائیبل کا عالم تھا اس لیے مجھے صاف محسوس ہو گیا کہ کیوں کوئی عیسائی پادری احمد دیدات کے مقابلے میں عیسائیت کا دفاع نہ کر سکا۔ میری تحقیق سے تین باتیں مجھ پر واضح ہوئیں کہ عیسیٰ علیہ السّلام خدا نہیں ہیں۔ بائیبل اپنی اصل شکل میں نہیں۔ اسلام کا یہ دعوی کہ کوئی معبود لائقِ عبادت نہیں سوائے ایک اللہ کے۔ نہایت سادہ، عقلی اور قابل فہم بات ہے۔ اب میرا ذہن مجھے آواز دے رہا تھا کہ آگے بڑھو اور فیصلہ کرو۔ مجھے اس بات کی فکر نہ رہی کہ میرے دوست رشتہ دار کیا کہیں گے؟ چنانچہ میں ایک دن الخبر کے تبلیغی مرکز میں گیا وہاں میں نے دیکھا کہ مختلف زبانوں میں لیکچر ہو رہے ہیں۔ میں فلپائنی گروپ کے ساتھ بیٹھ گیا اور جوں ہی لیکچر ختم ہوا، ان سے اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سب نے مجھے مزید مطالعہ کرنے اور غور کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں نے جواب دیا کہ میں نے اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ مجھے اس لمحے اور بھی تعجب ہوا کہ کوئی بھی شخص مجھے اسلام قبول کرنے کا نہیں کہہ رہا بلکہ مطالعہ اور غور و خوض کی تلقین کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہاں میں نے اسلام قبول کیا۔ سب لوگ باری باری مجھے گلے ملے اور بہت ہی خوش ہوئے میں وہاں سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں ایک سعودی باشندہ کہنے لگا کہ ارے تمہارا چہرہ تو مسلمانوں جیسا ہے۔ اس رات میں خوب سکون کی نیند سویا۔

صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد میں گیا لیکن میں نماز کے طریقے سے واقف نہ تھا۔ تھوڑی دیر مسجد کے باہر کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں ایک سوڈانی بھائی آیا۔ اس نے میرا مسئلہ بھانپ لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا اندر کیوں نہیں آتے۔ تو میں نے بتایا کہ کل رات ہی اسلام قبول کیا ہے اس لیے نماز کے طریقے سے بے بہرہ ہوں۔ اس نے مجھے ساتھ لیا۔ استنجا، وضو کا طریقہ سمجھایا اور مجھے کہا کہ جماعت میں شامل ہو جاؤ جیسے دوسرے لوگ کرتے ہیں ان کے ساتھ کرتے جاؤ۔ اور آخر میں دعا کرو اللہ تمہارے لیے راستہ کھول دے گا۔ جب میں نے پہلا سجدہ کیا تو بے حد سکون ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے پہلے دن سے لے کر آج تک کوئی نماز قضا نہیں کی۔ اس کے بعد میں باقاعدگی سے ہر شام تبلیغی مرکز جاتا رہا اور کئی گھنٹے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس دوران میں میری سالانہ چھٹی کا وقت آ گیا لیکن میں نے اسے بھی ملتوی کرا لیا تاکہ میری تعلیم کا حرج نہ ہو۔ اس دوران مجھے علم ہوا کہ اللہ

نے سود حرام کیا ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے جلد از جلد بینک کی نوکری چھوڑ دینی چاہیے۔ میری زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی لیکن میرے کولیگز اور ساتھیوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ میں لوگوں سے چھپ کر ادھر ادھر نماز ادا کر لیتا۔ ایک دن میں وضو کر کے سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ میرا اپنے انچارج عبداللہ صاحب سے آمنا سامنا ہو گیا۔ میرا چہرہ اور ہاتھ ابھی گیلے تھے انہوں نے حیرت سے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ میں نے کہا وضو کیا ہے انہوں نے کہا کہ کیا تم مسلمان ہو چکے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں بہت خوش ہوئے۔ اس دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور میرے اعزاز میں بہت شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس دن میں محسوس کر رہا تھا کہ گویا میں ان کی فیملی کا ہی ممبر ہوں۔ اسی طرح ایک دن میرے فلپائنی دوستوں نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میرا راز کھل گیا۔ وہ سب ایک کمرے میں جمع ہو گئے اور مجھے گھیر لیا۔ مجھ سے انہوں نے طرح طرح کے سوال کیے اور مجھے غدار کے لقب سے نوازا۔ پھر انہوں نے اسلام کے بارے میں مختلف سوال کیے میں نے ان کے ہر سوال کا مدلل جواب اور بائیبل کے حوالوں سے گفتگو کی۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا، انہوں نے مجھے تنہا کر دیا، اور مُجھ سے بات تک نہ کرتے۔ چنانچہ اِس تنہائی سے اُکتا کر میں نے ان کا مکان چھوڑ دیا اور ایک دوسرے نو مسلم فلپائنی دوست کے پاس شفٹ ہو گیا۔ اب ہم دو ہو گئے اور ہم دونوں نے مل کر علم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہم نے ایک مصری استاد سے باقاعدہ قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ بلکہ اصرار کر کے انہیں بھی اپنے گھر میں شفٹ کروالیا۔ اس طرح ہماری تعلیم کا سلسلہ تیزی سے جاری ہو گیا۔ مجھے بچپن سے گٹار اور پیانو بجانے کا شوق تھا۔ یہ آلات بھی میں معمولی داموں فروخت کر کے نجات حاصل کر لی اور میں فوراً اپنی بُری عادتیں اور سگریٹ نوشی چھوڑ دی اور اپنے آپ کو اسلام میں ڈھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ قبول اسلام کے بعد میں اب پہلی بار سالانہ چھٹیوں پر گھر جا رہا تھا۔ دل میں عجیب طرح کی کشمکش جاری تھی۔ میرے روم میٹ رضوان صاحب نے کہا کہ ان کی اہلیہ اور بچے بھی مسلمان ہو چکے ہیں۔ اب میں منیلا جاؤں تو ان سے ضرور ملوں اور انہیں اسلام کی تعلیمات سکھاؤں۔ چند دنوں کے بعد میں منیلا پہنچا تو میرے والدین میرے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ ہمارے ہاں مذہبی تعلیم یہ تھی کہ والدین کے احترام میں ان کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھنا چاہیے اور ہم ایسا ہی کرتے تھے لیکن اس موقع پر میں نے ایسا نہ کیا بلکہ باری باری ان کے ماتھے پر بوسہ دیا اس سے وہ بہت حیران ہوئے۔ بہر حال ہم خوشی خوشی گھر پہنچے۔ گھر پہنچ کر میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں میرے لیے سور کا گوشت حرام ہے۔ اس پر میرے والدین

چونک پڑے۔ انہوں نے کہا ہم نے تمہارے لیے خاص طور پر سؤر کی پسلیوں کے گوشت کا اہتمام کیا تھا۔ ہمارے ملک میں سؤر کی بھنی ہوئی پسلیوں کی ضیافت ایک بڑی ضیافت سمجھی جاتی ہے۔ میں نے نہ صرف ان کی ضیافت کو ٹھکرا دیا بلکہ واضح کیا کہ میں سؤر کے اجزا سے بنی ہوئی کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ میرے والدین نے میری درخواست مانتے ہوئے میرے لیے حلال کھانے کا اہتمام کیا۔ منیلا میں قیام کے دوران میں نے والدین اور رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی لیکن چونکہ میں دعوت کے اسلوب سے ناآشنا تھا اس لیے بیجا اصرار کرنے لگا۔ میری خواہش تھی کہ یہ لوگ جلد از جلد ہدایت حاصل کر لیں، مگر میرے اِس روّیے سے گھر کا ماحول کشیدہ رہنے لگا۔ بہت بعد میں یہ بات سمجھ آئی کہ میرا اندازِ دعوت ٹھیک نہ تھا۔ چھٹیوں کے بعد میں واپس سعودیہ آگیا۔ اگلے برس میں اور رضوان صاحب اکٹھے چھٹی پر گھر گئے۔ تو میری والدہ نے کوشش کی کہ میں دوبارہ عیسائی مذہب اختیار کر لوں، انہوں نے ایک پادری کو گھر بلایا۔ اس نے میرے ساتھ کافی دیر مکالمہ کیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ والدہ صاحبہ نے ایک اور پادری کو گھر بلایا اور خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں تاکہ ہماری بات چیت سن کر تجزیہ کر سکیں۔ والدہ ایک ٹیچر تھیں اور والد آرمی سے ریٹائرڈ تھے۔ والد صاحب اگرچہ بظاہر ہم سے الگ تھلگ تھے لیکن وہ بھی ہماری گفتگو کو توجہ سے سن رہے تھے۔ میں نے پادری صاحب کے ہر سوال کو خود بائیبل سے ہی رد کر دیا۔ جب ان کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہی تو وہ یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ اگلی بار وہ بڑے پادری صاحب کو لے کر آئیں گے، مگر یہ کبھی نوبت نہ آئی۔ پادری کے جانے کے بعد میرے والد نے والدہ سے کہا کہ تمہارے بیٹا کا علم پادری سے زیادہ ہے۔ رضوان صاحب کی طرف سے ان کی بیٹی کے ساتھ رشتہ کی پیشکش ہو چکی تھی۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ بینک کی نوکری چھوڑ کر شادی کروں گا۔ میں نے سعودی علما سے رائے لی سب نے بہت اچھی تلقین کی کہ نوکری چھوڑنے کی مخلصانہ نیت کرو اور جب تک دوسری نوکری نہ ملے یہ کرتے رہو۔ میں نے بہت جگہ انٹرویو دیے لیکن ان کے لیے یہ بات حیرت کا باعث ہوتی تھی کہ میں زیادہ تنخواہ چھوڑ کر کم پر کیوں ملازمت کرنا چاہ رہا ہوں۔ اس طرح مجھے نوکری کی تلاش کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔ کام موجود تھے لیکن لوگ مجھے نوکری دیتے نہ تھے کہ تمہاری تعلیم زیادہ ہے ہم یہ تنخواہ نہیں دے سکتے۔ بہت مشکل سے ایک کمپنی میں میں نے اس شرط پر ملازمت حاصل کی کہ میں ان سے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ نہ کروں گا۔ لیکن اس میں اللہ کا فضل یہ ہوا کہ مجھے دمام کے بجائے مدینہ منورہ میں جاب مل گئی اور میں بینک چھوڑ کر وہاں آگیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد

مُجھے نوکری ملی تو میری زندگی میں آنیوالا انقلاب مکمل ہو چکا تھا۔ اب اگلہ مرحلہ میری شادی تھا، چنانچہ اگلے برس میں اور رضوان صاحب جب اپنے وطن فلپائن گئے تو میری شادی ہو گئی۔ شادی میں بھی میں نے اپنے والدین سے درخواست کی کہ اسلامی طریقے پر ہو گی اس میں بھی انہوں نے مجھ سے تعاون کیا۔ اب میرے والدین مجھ سے کافی تعاون کرنے لگے تھے۔ رمضان میں نے منیلا میں گُذارا۔ میری والدہ میرے لیے سحری اور افطاری کا اہتمام کرتی رہیں۔ چھٹیوں کے بعد میں مدینہ منورہ واپس آگیا اور کچھ عرصے بعد اہلیہ کو بھی بلا لیا۔ اب ہماری دو بیٹیاں ہیں جن کے نام میں نے صفا اور مروہ رکھے ہیں۔ میری حتی المقدور کوشش ہوتی ہے کہ تبلیغی مرکز جا کر اعزازی طور پر خدمات انجام دوں۔ اور نئے مسلمانوں سے ملوں اور ان کا ایمان پختہ کروں۔ اسلامی یونیورسٹی کے طلبا کو بھی اعزازی طور پر کمپیوٹر کی تعلیم دیتا ہوں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ میری کوشش قبول فرمائے اور مجھے اور میری فیملی کو آخرت میں کامیاب فرمائے اور میرے والدین کو اسلام کی روشنی عطا فرمائے۔ آمین۔

گوتم داس

ایک ہندو کے قبولِ اسلام کا واقعہ

میں سانگھڑ کے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا۔ والدین نے میرا نام گوتم داس رکھا۔ ہم پانچ بھائی تھے اور میں تیسرے نمبر پر تھا۔ تھوڑی سمجھ بُوجھ ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ ہولی اور دیوالی کے تہوار منانا، مندر جانا اور پرشاد کھانا یہ سب میں بچپن سے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں گھر میں سب سے زیادہ مذہبی رجحان رکھتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جُلی آبادی تھی۔ مُجھے مسلمانوں سے سخت نفرت تھی۔ مُجھے ہر اُس چیز سے نفرت تھی، جو مسلمان کھاتے یا پسند کرتے تھے۔ میں ایک تشدد پسندانہ ذہن کا مالک تھا۔ میں ہفتے میں دوبار اپنے دوستوں کیساتھ مل کر خوب اہتمام سے مندر جایا کرتا تھا۔

پڑھنے کا مُجھے بڑا شوق تھا، میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا تو انٹر میں بآسانی میڈیکل میں داخلہ مل گیا اور پھر ایف ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کی تو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ میڈیکل کی تعلیم مکمل ہوئی تو میں جامشورو میں ہاؤس جاب کرنے لگا اور میری شادی بھی ہو گئی۔ اسی اثنا میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو میں نے بھائیوں سے مشورہ کر کے گاؤں میں کلینک کھولنے کیلئے جگہ خرید لی۔ یہ سب ہو چکا تو مجھے جاب کرتے ہوئے چھ مہینے بیت چکے تھے۔

ایک دن میرا ایک دوست میرے پاس آیا اور کہنے لگا: گوتم! چلو کراچی کارڈیو ویسکولر ہسپتال میں میں جاب کیلئے اپلائی کرتے ہیں۔ اِس سے قبل کئی بار میں دوستوں کیساتھ کراچی جانے سے انکار کر چکا تھا مگر اب میرے دوست نے اصرار کیا تو میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ ایک روز ہم چند دوست مل کر کراچی کارڈیو ویسکولر ہسپتال پہنچے اور سب دوستوں نے فارم لئے اور بھر کر جمع کروا دیئے، میں اپلائی نہیں کرنا چاہتا تھا اور دوستوں کو بتایا کہ میں تو ہاؤس جاب کے بعد اپنے گاؤں میں کلینک کھولوں گا، مگر میرے دوستوں نے زبردستی میرے بھی فارم جمع کروا دیئے۔

اللہ کی قدرت دیکھو کہ میں جاب کرنے سے بچنا چاہتا تھا مگر ایک ماہ بعد مجھے اور کچھ ساتھیوں کو انٹرویو کیلئے بُلا لیا گیا۔ دوستوں

کے اصرار پر میں نے انٹرویو دیدیا۔ ڈاکٹر پروفیسر اسد اللہ کنڈی صاحب نے انٹرویو لیا، میرے سابقہ کام کو سراہتے ہوئے اُنہوں نے تیس پینتیس لوگوں میں مجھے بھی منتخب کر لیا۔ اور جوائن کرنے کیلئے کہا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں تو گاؤں میں اپنا کلینک بنا چکا ہوں اور یہاں میں نے دوستوں کے اصرار پر اپلائی کیا تھا، اور پھر میرے پاس تو یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔ میں یہ جاب نہیں کروں گا۔ میرے انکار پر پروفیسر صاحب کہنے لگے ابھی تمہارے پاس کچھ روز کا وقت ہے، ذرا آرام سے سوچ لینا کہ تمہارے لئے کیا بہتر ہے؟ یہاں جاب کر کے تمہیں اچھی پریکٹس ہو جائیگی۔

میں جامشورو چلا آیا اور اپنی ہاؤس جاب کا وقت پورا کرنے لگا، اس دوران کئی مرتبہ پروفیسر صاحب نے مُجھے فون کر کے پوچھا مگر میں نے اُنہیں جواب دیدیا۔ ایک دن پھر اُن کا فون آیا مجھے کراچی آکر ملنے کیلئے کہا میں نہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا۔ کراچی آیا تو اُن کے ساتھ تفصیلی گفتگو ہوئی مگر اُن کا اصرار میرے انکار کو اقرار میں نہ بدل سکا۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر تم جوائننگ نہیں دوگے تو ہم کسی اور کو تمہاری جگہ دیدیں گے مگر میں انکار کر کے چلا آیا۔ ہسپتال سے باہر نکلا تو میرا ایک گاؤں کا دوست مل گیا۔ اُس نے پوچھا: گوتم! تم یہاں کیسے آئے؟ میں نے اُسے ساری کہانی سنائی تو وہ بولا: دوست! بہت بڑی غلطی کر رہے ہو، تم جوائننگ دو، جگہ کیلئے پریشان مت ہو، وہ میں تمہیں دوں گا، بلکہ تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔ دوست کی حوصلہ افزائی سے میں قائل ہو گیا اور فیصلہ کیا کہ پیشکش کو ٹھکرا کر کفرانِ نعمت نہیں کروں گا۔ بھائی کو فون کر کے ساری بات بتائی اور سمجھایا کہ کلینک کیلئے مجھے دل کے امراض کا بھی تجربہ ہو جائیگا، اور گاؤں کے لوگ اس سے مُستفید ہو سکیں گے۔ بھائی نے بڑی مشکل سے رضامندی کا اظہار کیا تو میں نے فوراً پروفیسر صاحب کو جوائن کرنے کیلئے بتا دیا۔ وہ میرے جواب سے خوش ہو گئے۔

کارڈیو ویسکولر ہسپتال جوائن کیا تو میری زندگی میں بھی انقلاب کی ابتداء ہو گئی۔ ڈاکٹر زیادہ تر ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں کرتے تھے جہاں دو تین اموات روز کا معمول تھیں۔ پہلے دن جب میری ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں لگی۔ تو وارڈ میں ایک مریض کی طبعیت اچانک بگڑ گئی۔ ہم اُسے ٹریٹمنٹ دے رہے تھے، جبکہ اُس کے عزیز و اقارب بلند آواز میں قُرآن اور درود پڑھ رہے تھے۔ یہ بات میرے دل میں نقش ہو گئی۔ آہستہ آہستہ میں بھی مسلمان ڈاکٹروں کی طرح ہو گیا، جب کسی مریض کی طبعیت بگڑتی، میں اُس کے عزیز و اقارب سے بلند آواز میں قُرآن پڑھنے کیلئے کہتا۔ یہ سب معمول میں ہونے لگا اور انجانے میں

اسلام میرے وجود میں سماتا جارہا تھا۔ میری نفرت ختم ہوتی جارہی تھی اور دن رات میری زبان سے اسلام کے کلمات ادا ہونے لگے۔ اب مجھے یہ بات سمجھ آنے لگی کہ مسلمان ہونا ہر کسی کے نصیب میں نہیں، یہ تو اللہ کی خاص رحمت ہے جو کسی پر ہو جائے۔ مریضوں کے عزیز واقارب حیران ہوتے تھے کہ ہسپتال میں میرے نام "گوتم داس" کی تختی آویزاں تھی اور میں الحمدوللہ اور انشااللہ کے ساتھ اُنہیں قُرآن کی تلاوت کیلئے بھی کہتا تھا، اور اُنہیں کہتا کہ کہ قُرآن پڑھ کر مریض کیلئے دُعا کرو اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ یہ سب کچھ میری زبان سے بے ساختہ ادا ہو رہا تھا۔

ایک روز میری مُلاقات ایک فیملی سے ہوئی، اُن کی والدہ ہسپتال میں ایڈمت تھی۔ میں چونکہ مریض کی توجہ سے دیکھ بھال کر رہا تھا اس لئے وہ لو مُجھ سے مانوس ہو گئے۔ یہ لوگ گُلستانِ جوہر میں رہائش پذیر تھے ایک روز اُنہوں نے مُجھے گھر آنے کی دعوت دی اور پھر آہستہ آہستہ میں اُن کے گھر آنے جانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ جونہی اذان کی آواز آتی، گھر کی مالکن سب کام چھوڑ کر نماز کیلئے اُٹھ کھڑی ہوتیں۔ گھر میں چند بچیاں تھیں جنہیں ایک عالمہ پڑھانے کیلئے آتی تھی۔ ایک دن میں نے اُس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو پوچھا کہ یہ کیسی کتاب ہے؟ وہ بولی: یہ قُرآن پاک ہے، میں نے دیکھنے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے قُرآن کو پیچھے ہٹالیا اور بولی: اِسے ہاتھ لگانے سے پہلے باوضو ہونا ضروری ہے۔

میں حیران ہو کر بولا: اگر یہ واقعی اتنی اہم کتاب ہے تو تم لوگ اِسے پڑھتے کیسے ہو؟

وہ بولی: بہت سے لوگ تو اِسے زبانی یاد کر لیتے ہیں۔

میں حیران ہو گیا اور بولا: اتنی بڑھی کتاب کیا واقعی لوگ ازبر کر لیتے ہیں؟

وہ بولی: ہاں یہ تو اللہ کا کرم ہے جو یہ کتاب لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

میں عالمہ کی بات سُن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ ہسپتال میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نت نئے انکشافات میرے سامنے آ رہے تھے۔ میں نے اسلام کے بارے میں اب سنجیدگی سے مطالعہ شروع کر دیا تھا اور اکثر دوستوں سے لمبی لمبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ایک روز دوستوں کی دعوت میں بڑے گوشت کی ڈش بھی تھی۔ وہ کہنے لگے کہ تم تو بڑا گوشت نہیں کھاؤ گے؟ میں نے جواب دیا نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اب بدل چکا ہوں۔ ایک روز چند دوستوں نے ایک تقریب کا اہتمام کیا

کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تم مسلمان ہو گئے ہو، بڑا گوشت کھاتے ہو اور پھر دینِ اسلام کے بارے میں طویل گفتگو بھی کرتے ہو۔ پھر انہوں نے ایک خوبصورت قُرآن مُجھے تحفے میں دیا۔

اسلام اب دن بدن میرے وجود میں سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ میں گاؤں جاتا تو مندر بھی نہیں جاتا تھا۔ ماں پوچھتی تو میں ٹال جاتا تھا۔ بتوں سے اب مُجھے نفرت سی ہو گئی تھی۔ گاؤں میں ایک دو روز سے زیادہ نہیں رُکتا تھا کیونکہ میرے مندر نہ جانے، ہولی اور دیوالی نہ منانے سے گھر والوں کو شک ہونے لگا تھا۔ میں دو تین سال تک صُبح کے وقت ڈاکٹر ذاکر نائیک اور دوسرے اسلامی پروگرام باقاعدگی سے دیکھتا رہا۔ میں اب اسلام کے بہت قریب ہو گیا تھا۔

میری حرکات و سکنات سے گھر والوں کو کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے مُجھے بہانے سے گاؤں بلایا اور یہ کہہ کر کمرے میں قید کر دیا کہ ہمیں تمہارے مسلمان ہونے کا پتہ چل گیا ہے۔ دورانِ قید وہ مُجھ پر تشدد کر کے اسلام کو چھوڑنے کیلئے دباؤ ڈالتے رہے۔ کراچی میں میرے ساتھی ڈاکٹروں کو علم ہو گیا کہ مُجھے گاؤں میں قید کر دیا گیا ہے تو میری ایک ساتھی لیڈی ڈاکٹر نے دن رات سورہ مُحمد (ﷺ) کی تلاوت شروع کر دی اور رہائی کی دُعا مانگتے ہوئے نوافل بھی پڑھے۔ پھر کچھ ایسا مُعجزہ ہوا کہ میں قید سے نکل کر کراچی آ گیا۔

اب میرا ڈر خوف جاتا رہا اور میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ لوگوں نے مُجھے واپس گھر لوٹ جانے کو کہا مگر میں اسلام کی راہ میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ اب لوٹنا میرے لئے موت سے کم نہ تھا۔ ساتھیوں سے مشورہ کر کے میں ایک دن دارالعلوم کراچی گیا اور مُفتی منان صاحب کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا۔

جونہی میں نے کلمۂ شہادت پڑھا: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''

مُجھے یوں لگا جیسے منوں بوجھ میرے سر سے اُتر گیا ہے۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے مفتی صاحب نے پوچھا: اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟

میں نے کہا: مفتی صاحب! اگر آپ کے ہاتھ پر تھوڑی سی روئی رکھ دیں تو کتنا وزن محسوس کریں گے؟

وہ بولے: نہ ہونے کے برابر۔ میں نے کہا: مفتی صاحب میں بھی اپنے آپ کو روئی کی طرح ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ دوسرے روز میں نے گاؤں فون کر کے یہ خوشخبری اپنے گھر والوں سُنائی تو وہ بہت ناراض ہوئے مگر میں نے کوئی پرواہ نہیں کی، کیونکہ

میں نے اپنے بیوی بچوں بھائیوں اور ماں کو چھوڑ کر اپنے رب کو راضی کر لیا تھا۔

مُفتی صاحب نے میرے ساتھ مشاورت کرتے ہوئے میرا نام "محمد احمد" رکھ دیا۔ میں نے قُران کو ترجمہ کیساتھ پڑھنا شروع کیا تو میرے ذہن پر پڑی دُھند چھٹنے لگی۔ میں ماضی پر نظر دوڑاتا تو سوچتا کہ ہم کتنے نادان تھے جو خالقِ حقیقی کو چھوڑ کر مٹی کے بے جان بتوں کو پوجتے اور اپنی مشکلات بیان کرتے تھے۔ پھر اللہ نے کرم کیا جو مجھے دینِ حق کا راستہ دکھا دیا۔ میں اللہ کی عنایات کا مشکور ہوں کہ اُس نے مجھ جیسے گنہگار کو دینِ اسلام میں داخل فرما دیا۔ میں نے قرآن و حدیث اور سنتِ رسُول ﷺ کو اپنی زندگی کا سہارا بنا لیا ہے۔ اب مجھے خلافِ اسلام کام کو دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے۔ اور مسلمان نسل کو جب کیبل اور انٹرنیٹ کا منفی استعمال کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو رنج ہوتا ہے، اور مجھے یہ بات یاد آجاتی ہے کہ "جب کسی کو ثواب کے کام سے خوشی اور گناہ کے کام سے رنج پہنچے تو وہ سچا مومن ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ہر مسلمان کو راہِ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿النسأ۔86﴾

اور جب کوئی تمکو دُعا دے تو جواباً تم بہتر کلمات سے اُسے دُعا دو یا پھر انہی لفظوں

سے دُعا دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

مُصنّف کی دوسری کتابیں

CONTACT: seratulmustaqeem@gmail.com

راہِ ہدایت پبلی کیشنز